

**THE BOOK WAS
DRENCHED**

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_222653

UNIVERSAL
LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۸۹۱۶۴۳.۸ Accession No. ۱۶۴۹۸

Author حق نور اختر ج - ب

Title کلمے معنی تارک

This book should be returned on or before the date last marked below.

بکھرے ہوئے تارے

از

حق نواز خاں اختر



علی بھائی شرفعلی اینڈ کمپنی لمیٹڈ

منسبہ سہ ابراہیم رحمت اللہ روڈ بمبئی

قیمت تین روپیہ آٹھ آنے
کتاب خانہ عابد روڈ حیدر آباد دکن

جملہ حقوق محفوظ

پرنٹر۔ سلطان علی ایف۔ واولا

مطبع محمدی گنیاؤڈ۔ روڈ بجگاؤں مہی

الکان، علی بھائی شرفعلی اینڈ کمپنی لمیٹڈ

”انتساب“

اُن پر خلوص دلوں کے نام جو امنِ عالم، باہمی یگانگت
اور ہندو مسلم اتحاد کے متمنی ہیں۔ اور جن کا عقیدہ اس قول پر مبنی
ہے۔

”مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیرکھنا“

حق نواز خاں اختر

رتن دہار۔ سیوا جی پارک ممبئی
یکم جنوری ۱۹۴۵ء

فہرست عنوانات

صفحہ	عنوانات	صفحہ	عنوانات	صفحہ	عنوانات
۱۲۹	عورت کی فطرت	۵۸	راجہ اور بھکاری	۱	شاعر کی دعا
۱۳۴	بیدان	۶۰	وہ رات !	۳	جوگی
۱۳۹	دطن کا پجاری	۶۲	آبدیار	۶	جاوید - آجاؤ
۱۴۵	قیدی	۶۴	نالاول	۹	ایک روان بھری رات
۱۵۲	اچھوت کا گناہ	۶۵	پرہیزگس	۱۱	نغمہ حیات
۱۵۴	بھکارن	۶۶	راہی	۱۲	راگ کا جادو
۱۶۵	دلچسپ بھول	۶۷	اجنبی دیس کے باسی	۱۴	وہ رات پھر کبھی نہ آئیگی
۱۷۰	مسکراہٹ	۶۹	چاند	۱۷	جدائی کے تیر ۲۱
۱۷۴	تین حادثے	۷۰	مسافر	۲۱	یوسف سے ۲۱
۱۸۱	راز محبت	۷۵	نغمہ حیات	۲۵	پجاری
۱۸۵	نئی سادھی والی	۷۷	رومال	۲۷	پردہ کی پیٹھ کے نام
۱۹۲	نامہ اسے درد	۸۰	محروم	۲۹	افق کے اُس پار
۲۰۰	انارکلی	۸۱	سفر	۳۱	جد بے سفر
۲۰۷	بیچارہ فضلہ	۸۲	سمندر	۳۳	مسافر
۲۰۷	روڈ وارز مذاں	۸۵	میتا	۳۵	ساجن کی یاد ۱۱
۲۱۴	رقاصہ کے نام محبت نامے	۸۶	کل	۳۹	مجھے محبت ہے
۲۱۸	خاموشی	۸۷	چاند کی کرن	۴۱	دیا رجب میں ۱۱
۲۲۴	پردہ کی ماہی	۸۹	راگھو	۴۳	پیام کی آس
۲۲۷	تلاش ناکام	۹۱	تقریب محبت	۴۵	نغمہ محبت
۲۳۰	بھولی بھری بات	۹۳	دھکی جوانی	۴۷	کون
۲۳۴	چلتی پھرتی لاشیں	۱۰۱	اندھا بھکاری	۴۹	مانجھی
۲۳۹	ادیب کی موت	۱۰۷	زگس	۵۱	اُداس پرندہ
۲۴۴	اُس کی میتا	۱۱۳	نیلا لٹاف	۵۲	مجھے یاد آ ۲
۲۵۱	کھڑکی میں سے	۱۱۹	زندگی کی دو تصویریں	۵۴	ایک خط بھولنے والے کے نام
۲۵۵	رہگذر یاد	۱۲۲	ادشا	۵۶	پردہ کی ساجن سے

پیش لفظ

بڑے نام سے ابتدا کر رہا ہوں !

آغاز

ایک بار مجھ سے کسی نے پوچھا :-
آپ افسانے پسند کرتے ہیں ؟
میں نے جواب دیا - میں بندہ خدا ہوں - جب خدا اس حد تک
افسانہ پسند ہے کہ اُس کی آسمانی کتابوں میں بھی افسانے ہیں - تو
اُسکے بندوں کو افسانے کیوں نہ پسند آئیں گے ۔

تاریخ جن فنون لطیفہ کو اپنے سینے سے لگائے رکھتی ہے ان میں سے ایک فن
کہانی ہے جو انقلاب زمانہ کے ساتھ ساتھ بدلتی جاتی ہے ۔

رچرڈ ٹن نے اپنے مشہور ناول ماسٹر آف انگلش میں لکھا ہے کہ کہانی
اولین دور دنیا کی محبوب ترین شے ہے - عین ممکن ہے کہ اس کی ابتدا اس وقت

(ب)

ہوئی ہو جب انسانیت بچنے کی طرح گھٹنوں کے بل چل رہی تھی۔

دوسرا دور مارون کے قول کے مطابق دوسرے دور میں انسان کے لرزے ہوئے ہاتھوں میں قلم آگیا۔ اور وہ پتھروں پر پتوں پر چھوٹی چھوٹی تصویروں کی شکل میں خاموش کہانیاں لکھنے لگا۔

تیسرا دور جب ان کہانیوں میں تسلسل پیدا ہوا۔ انسانوں کے گروہ میں رہبر بندی کے جذبے نے راجے اور سردار پیدا کئے تو انسانیت کی توہمی زبان پر راجہ اور رانی کی چھوٹی چھوٹی کہانیاں آنے لگیں۔

چوتھا دور چوتھے دور میں کہانی ایک فن گئی۔ درباروں میں داستان گو اپنی فن کاری دکھانے لگے۔ الف لیلا۔ چہار درویش۔ طہر ہوشربا کے افسانے دہسپیوں کا ایک نیا باب لیکر آئے۔

پانچواں دور اور پانچویں دور میں انسان نے زندگی کو زندگی کے بھیس میں دیکھا۔ انسانی علم، انسانی خوشیاں، انسانی مسائل، زندگی کا درد جزر۔ اور شیب و فرار۔ اخلاقیات اور جنسی معاملات۔ مذہب اور عقلیت۔ ایمان اور سائنس ان سب پر انسانی نگاہیں تاریکی میں ٹارچ لائٹ کی طرح گھومنے لگیں۔ دیدہ و دل کے مشاہدے الفاظ بن کر ساری دنیا میں بکھر گئے۔ لیکن، انسانیت، موباساں، جیک لنڈ، اناطول فرانس، رامند ناتھ ٹیگور، بنکیم چندر، حسرت چندر، پریم چند اسی روشنی کی کرنیں بن کر اپنے اپنے وطن کی محفل میں آجالا کرنے لگے۔ نوجوانی نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ اور ترقی پسند ادب کے نام سے سرزمینِ فسانہ نگاری میں نئے نئے پھول کھلائے۔

(ج)

کرشن چندر۔ راجندرنگہ بیدی شفیق الرحمن مینو عصمت چغتائی ترقی پسند ادب لیکر آگے بڑھے۔ اس شعل میں نہ صرف انسانیت کا چہرہ نظر آیا۔ بلکہ اسکے دل و دماغ میں منقوش وہ دہتے بھی جنہیں دیکھ کر اخلاق اور سماج چلا اٹھے۔ مذہبے گالیاں دیں لیکن وہ بڑھتے جا رہے ہیں۔ اور تنقید ان کے ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔ اس کا رواں کے پیچھے پیچھے وہ مسافر بھی ہیں جن کی جبین پر ابھی تک ٹاسٹائی اور یگور کی ادبی شعاعوں کا نور ہے۔ انسانی سماج کے گرد و غبار سے اٹے ہوئے چہروں میں اخلاق قدیمہ کی جھلک ہے۔ ان ہی مسافروں میں ان کہانیوں کے میر و حق نواز اختر ہیں۔ جن کی زبان دانی میں ادب قدیم کی لطافت اور چاشنی ہے خیالات میں جدت ہے۔ جدید ترقی پسند ادب کی ہمنوائی کرتے کرتے کبھی وہ کہانی کے بنیادی پلاٹ کو چھوڑ کر تخیلات کا تانابن دیتے ہیں۔ اور کبھی قدیم رنگ کا سہارا لیتے ہوئے کہانی کے تمام کرداروں کو آگے بڑھتے ہوئے افسانوی عروج کی طرف لے جاتے ہیں۔ یہی تفکر ان کے افسانوں کی روح ہے سرمایہ پرستی کے پیہم مظالم کی تصویر میں اختر نے رنگ آفرینی کی ہے غریب اور مزدور اس کے افسانے میں آئیں بھرتے ہوئے نظر آتے ہیں کبھی کبھی وہ اپنے افسانہ میں اس دنیا سے ماورائی ماحول پیدا کرتا ہے جہاں رومانیت ہے شعریت ہے۔ اور کہیں کہیں یہ سب خواب مدہوش ساقی کے ہاتھ سے گرتے ہوئے ساغر کی طرح منتشر ہو جاتے ہیں۔ اختر کے افسانے اسکا بہترین تعارف ہیں۔

اور اس کتاب کے ناشر مہارکباد کے حقدار ہیں کہ انھوں نے اختر کو دنیا کو

(د)

ادب سے رُوشناسی کرنے میں اس نوجوان سے تعارف کیا۔

قمر جلال آبادی

پر بھات فلم کمپنی - پونا -

۲۶ جولائی ۱۹۴۵ء

شاعر کی دُعا

بہار کی مدہوش کن چاندنی رات تھی۔ ماہتاب سیم پاش تھا۔ اس کی پہلی کرنیں فضا میں رقصاں بھٹیں۔ گھنے درختوں کی شاخوں میں چاندنی اونگھ رہی تھی پھولوں کی عطر بیز ہوائے فضا میں مہک پیدا کر دی تھی۔ نیند کی حسین سارہ نے تمام دنیا کو مسح کر دیا تھا فضا میں دُور — بہت دُور۔ کبھی کبھی فرقت زدہ کونل کی کوک سنائی دیتی تھی۔

ایک فلسفی شاعر۔ در ماندگی کا پیکر۔ افکار و آلام کی زندہ تصویر جس کی آنکھوں سے نیند کا فور ہو چکی تھی اور سین خواہوں کی دنیا غم و اندوہ کی پہنائیوں میں گم ہو چکی تھی (آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار رواں۔ جیسے گنگا جمن کا سبوغ) یوں گویا ہوا۔

اے اطر اور انجان۔ اے شمریت کی دیوی۔ اے سرو قد۔ رعنائی حُسن کی تصویر حسین جمیل مرمرین مجسمے۔ اے مغرور عشوہ طراز شاہ مغرور و ملکنت کی زندہ صورت مجھے تجھ سے محبت ہے والہانہ محبت۔ میرے دلاویز خوابوں کی سہانی دنیا با مال ہو چکی ہے۔

میری زندگی مسرتوں سے معمور تھی۔ میرے لبوں پر ستم کا ارتعاش تھا۔
 لیکن اب — یاس و سرمان کی تصویر ہوں۔
 میرے دل میں تناؤں نے طوفان بپا کر رکھا ہے
 تیری مفارقت نے میرے دل حزیں پیغم کی بجلیاں گرا دی ہیں۔
 اے شہریت کی دیوی آ
 اور اپنے حسن لایزال کے نور سے میرے دل کی تاریکی کو مبدل بہ نور کر دے
 میری خفتہ آرزوں کو بیدار کر دے !

آخر !

وہ آہی گئی جس کے لئے شاعر سراپا انتظار تھا۔
 نور جمال کا ایک ٹکڑا بغیرت صدچین۔ شاہد دلر باہر حرکت سے حسن نمودار ہوا
 سے غرور ہویدا۔ ہر قدم فتنہ خیز۔ حشر بدوش۔ اظہار انجان۔ سر پر کونوں کا تاج۔ مدھ بھری
 آنکھیں آسمانی کو اکب دار فرغل میں مبوس دفنا خوشبو سے معمور ہو گئی۔ وہ آتے ہی
 یوں گویا ہوئی۔

”اے شاعر! کائنات زندگی کی تفسیر فطرت کے راز دار۔ سرگشتہ خزن و
 ملال۔ سراپا سگوار۔ الم نصیب۔ اے مہنون۔ اے نقیب قوم و وطن۔ عکاس جذبات بلغم
 کیا ہنچتا ہے۔ تیری دعائیں مجھے یہاں کشاں کشاں کیسے لاتی ہیں۔“
 شاعر نے ملتی ننگا ہوں سے دیوی کی طرف دیکھا اور کہا۔
 ”اے دیوی۔ مجھے تخیل۔ تاثیر۔ سوز و گداز عطا کر دے !“

جوگی

جوگی اپنی بین زمین پر رکھتے ہوئے یوں گویا ہوا
 "میں بین اچھی طرح بجاسکتا ہوں"

اس کی موٹی موٹی سیاہ آنکھوں میں سُرخ سُرخ ڈورے تھے۔ ایسے جیسے
 کوئی عادی میخوار ہو۔

اس کی لمبی لمبی جٹائیں شانوں پر لاابالیا انداز سے منتشر تھیں۔ اس کی پیش
 دراز جسکے خط بنے ایک عرصہ دراز ہو چکا تھا گیر دے رنگ کے چاک گریبان کو چھپو
 رہی تھی۔ اُسکا ماتھا شکن آلود تھا۔ اُسکے چھدے ہوئے کانوں میں بھورے بھوئے
 رنگ کے مُندے لٹک رہے تھے۔

"ہاں میں کیسلی سروں میں بین بجاسکتا ہوں"

میں نے یہ دلکش راگنی عندلیب زار سے حاصل کی ہے۔ میں نے یہ زیر و بم
 جھگل کی آزاد ہوا سے سیکھا ہے۔ میں نے یہ گیت پہاڑی ندی کے گیتوں سے لکھنا
 کیا ہے۔

میری بین میں اضطراب اور سوز و گداز ہے۔

میں نے مضطرب نفہ، مضطرب پیسے کی "پی کہاں" سے لیا ہے۔
میں نے یہ سوز و گداز کوئل کی کوک سے چڑایا ہے۔
میری بین میں موسیقی چل رہی ہے۔

اگرچہ میرے لب شعریت کے لئے ناموزوں ہیں۔
لیکن! میری بین میں موسیقی و شعریت کا بے پایاں سمندر ہے جس کی
منظماں امواج عالمگیر ہیں۔

میں راگ سے مٹھو رہو کر اس کی گلابی گلابی آنکھوں کو دکھایا۔
موسیقی میری نس نس میں سما گئی۔ موسیقی میرے دل کی پنہائیوں میں بس
گئی۔

میں نے بیکل ہو کر شہر اور شہر کی رنگینیوں کو سچ دینے کی ٹھان لی۔ آخر میں نے
ان ہنگامہ خیز دلچسپیوں کو خیر باد کہہ دیا۔ اور چل دیا۔ ابدی زندگی حاصل کرنے کے لئے۔
مضطرب روح کو قرار دینے کے لئے۔ میں نے طوفان بپا کرنے والی بین کا حشر دیکھا
نفہ سنا۔ میں ایک عرصہ تک جنگلوں میں گھوما کیا۔ میں نے مرغزاروں میں لالہ کو
مرجھائے ہوئے دیکھا۔ پہاڑی ندی پر موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ عندلیب
سردا ہیں بھر رہی تھی۔ پہلی "پی" کے فراق میں گھائل ہو چکا تھا۔ آموں میں بورا گیا
تھا۔ کوئل دور، بہت دور باغوں میں چلی گئی تھی۔

میں نے جوگی کی سیاہ آنکھوں کو دیکھا۔ نیم وا سُرُخ سُرُخ
دُوروں میں کھوئی ہوئی۔

میں نے جوگی کی بین پر لیک نظر ڈالی۔ اُس میں موسیقی و شعریت کا ایک بحر
 بیکراں اب بھی موجزن تھا جس کی موجیں عالمگیر تھیں لیکن میں پژمرده ہو چکا تھا۔
 سکوت کی زندگی سے بیزار.....

جاوید آجاؤ

(جاوید مرحوم کے نام)

رات بیوہ کے مستقبل سے زیادہ تاریک تھی۔ ہرست موت کی سی خاموشی
طاری تھی جب وہ مجھے داغ مفارقت دے گیا۔ آہ! اس کی ننھی سی روح بھیاںک
تاریکی سے دوچار ہوئی ہوگی۔

آج کی رات اس سے بھی زیادہ تیرہ ونا رہے جبکہ وہ ہمیشہ کے لئے مجھ سے
جدا ہو گیا میں اپنے جاوید کو پکار رہی ہوں۔ اے ننھے میرا آغوش تنہا ہے
لئے بیابانہ وا ہے۔ دنیا نیند میں کھوئی ہے۔ ننھے ننھے ستارے باہم سرگوشیوں میں
مشغول ہیں۔

آجاؤ..... میرے ننھے ایسے میں کوئی بھی نہ جان سکیگا۔

ابھی بس را کا آغاز ہی تھا کہ موت کے بیرحم ہاتھوں نے ایک ننھی سی کلی
کو کھلنے سے پہلے ہی سل دیا۔ سُرخ کلیاں مسکرا رہی ہیں۔ درخت سبز لباس
زیب تن کر رہے ہیں۔ یاسمن کی بھینی بھینی خوشبو سے صحن چمن سا ہوا ہے۔ بہا
نکھار رہے۔

میرے جاوید... آجاؤ۔ تیرے بھولی والہانہ انداز میں مسرت و شادمانی سے بخود ہو کر سورج مکھی کی پتیاں فضا میں پھیر رہے ہیں۔

میرے ننھے آجاؤ... ایسے میں کوئی بھی نہ جان سکے گا۔
قدرت کے ننھے کھلوے صحن چمن میں کھیل کود میں مشغول ہیں بہشتِ قیم کی دولت بھی اُن کے آگے بیچ ہے۔ اُن کے بلند عیس قہقہے فضا میں لہرا رہے ہیں لیکن اُن میں وہ مرغوب ترین آواز جو میرے کانوں میں رس گھول دیتی تھی، مفقود ہے جب میں اس کھر کی میں ٹپکتی ہوں۔ جسے ہار سنگھار کے پھولوں نے ڈھانپ رکھا ہے تو میں پکارتی ہوں۔

آجاؤ..... میرے ننھے آجاؤ۔

تمہاری ماں کا دل تمہارے فراق کے صدمے سے پاش پاش ہو چکا ہے۔ اس کی آنکھیں تمہارے انتظار میں سہرا پا انتظار ہیں۔ تمہاری میٹھی میٹھی آواز سننے کے لئے اس کے کان بیتاب ہیں۔ ننھے اگر تم ایک لمحہ کے لئے اپنے سُرخ سُرخ دمکتے گالوں کا بوسہ دے جاؤ تو ایسے میں کوئی نہ جان سکیگا.....

شہرِ خموشاں کے مکس کس سکون و اطمینان سے سو رہے ہیں۔ ہر طرف ہو کا نام ہے۔ ایک طرف مٹی کی تازہ ڈھیری جس پر گھاس ریگ رہی ہے، تیری بڑی آرام گاہ کا پتہ دے رہی ہے میں خاموشی کی رد میں پہنچ جاتی ہوں۔ اچانک فاختہ کی 'کو کو' اس ظلم سکوت کو توڑ دیتی ہے۔ اور یہ آواز مجھے اس مصوم کی یاد دلاتی ہے، جو میری آنکھوں کا نور اور دل کا سرور تھا۔ جو میری گود میں بچکر اپنی قوت ملی زبان میں

دلکش گیت سنایا کرتا تھا

میں پکارتی ہوں - آج ساؤ - میرے ننھے جاوید آجاؤ -
 آہ! تم کیوں اپنی پیاری ماں کو فراموش کر بیٹھے ہو تمہاری نگین ماں
 تمہارے لئے سراپا انتظار ہے - میرے ننھے! اگر تم گیت سنانے کے لئے ایک
 لمحہ کے لئے آجاؤ تو کوئی بھی نہ جان سکیگا۔

ایک رومان بھری رات

چاندنی رات تھی — ہر طرف نور کی رو پہلی چادر بھی ہوئی تھی —

ہر چہار سو

دریا کا کنارہ تھا — ماہتاب کی کشتی نور کی بتقیر لہروں میں
ہچکولے کھا رہی تھی۔ خاموشی نے — سکوت کے نغمے الاپ کر ہر چیز کو
مدہوش بنا دیا تھا —

خود رو پھول شراب نہکت اندیل رہے تھے۔
ہواؤں میں آوارہ پھر رہی تھیں ان کی خوشبو میں۔
بیری خورشید — میرے پہلو میں تھی — تماشہ دیکھ رہے تھے ہم
— چلتی لہروں کا۔ —

مستی پھلک رہی تھی اس کی آنکھوں سے — ہنس رہی تھیں وہ
آنکھیں۔ —

لب متسم تھے۔ — گویا سکر اہٹ ناچ رہی تھی — برگ گلاب ایسے
نازک ہونٹوں پر —

میری خورشید — میرے دل کی دنیا میں — اور میں — خورشید
کے دل کی دنیا میں !

کھو گئے تھے ہم دونوں — سمٹ گئے تھے ہم دونوں
ایک دوسرے میں -

ہم دونوں محبت کے جھوٹے میں دیکھ رہے — منو ہر پُسنے
بڑے دلفریب تھے یہ خواب — میرے دل پر نقش ہیں
اُس رومان سے بھر پور رات کے لمحات
وہ کبھی نہ بھولنے والی گھڑیاں — آہ وہ رات جو بیت گئی

نہ صرف میں - بلکہ میری خورشید - میری دنیا کے محبت بھی منتظر ہوگی
اس رومانی رات کی - کیا عجب وہ میرے خیالی مجسمہ سے مخاطب ہو کر
کہہ رہی ہو -

”میری راتیں کتنی بے کیف ہیں - تیرے بغیر - آلم اور وہ رات - کتنی دلفریب
کیف آگین تھی
کتنی سُندر تھی جیون کی وہ رات“

نغمہ حیات

زندگی — اک نغمہ ہے — ابدی و سرمدی
 زندگی — اک گیت ہے — ترنم ریز — کیف آگیں۔
 مدھر گیت ہے — جھرنے کا
 مسو کرُن ہے — پھولوں کی مہک سے بھی
 زندگی کا راگ ہے میٹھا — حوروں کی پازیب کی جھنکار سے بھی
 مگر آتا ہے اک لمحہ ایسا بھی — سراپا سوز بن جاتا ہے یہ نغمہ۔
 شیرینی کھو دیتا ہے — یہ راگ میٹھا۔
 ریلی تانیں اس کی — بن جاتی ہیں آہیں۔
 جوئے زیر و بم میں — طوفان اُٹھتا ہے آہ و شیون کا۔
 ہو جاتا ہے طاری — اضطرابِ بہیم — بساطِ روح پر
 آہ یہ لمحے کچھ بھی نہیں۔
 منوہر گیتِ زندگی کا — بن جاتا ہے اک سُپنا۔

راگ کا جادو

چاندنی کا دریا لہریں لہریں لے رہا تھا۔ ماہتاب کا حُسن پورے جوہن پر
 تھا۔ دریا کے دھارے پر ایک کشتی ہوئے ہوئے بہہ رہی تھی۔ بلکہ موسیقی شباب
 کی مسیتوں میں مخمور اپنی مرمری انگلیوں سے برہم کے تاروں میں ارتعاش پیدا کر رہی
 تھی۔ گستاخ کرنیں اس کے لائے لائے سیاہ بالوں سے شوخیال کر رہی تھیں
 ایک شاعر جسکا لباس حاجتِ رفو سے بے نیاز تھا، راگ سُن رہا تھا۔ اُس پر
 بیخودی کا عالم طاری ہو گیا۔ وہ ماحول سے بے پروا ہو کر اسکے زیر و بم پر سر دھن
 رہا تھا۔ رورہ تھا۔ نہ جانے کیوں آنکھوں سے آنکھوں کا سیلاب جاری تھا۔ اس
 نے دعا مانگی۔

”اے مالک! مجھ سے میری بیانی۔ تو انائی۔ سب کچھ لے لے۔ اور صرف
 یہ سوز! یہ لے!! یہ ترنم!!! اور یہ درد مجھے عطا کر دے۔“

شاعر نے کشتی کی جھلک دیکھی۔ اگلے لمحے اس کی آنکھیں بے بصیر تھیں۔
 اس کی آواز میں درد تھا۔ ترنم تھا۔ اک سوز تھا۔

وہ ہاتھوں میں برہم لئے ہوئے خود ساختہ گیت گاتا اور اُس پر محویت کا عالم

طاری ہو جانا۔ لوگ اُسکے نغمے سُکر عالمِ کیف میں گم ہو جاتے لیکن شاعر ان کیفیات سے بے خبر تھا۔ اُسے کیا معلوم کہ اس کی دعا قبول ہو چکی تھی۔

وہ رات پھر بھی نہ آئے گی

بہار کی مدہوش کن چاندنی رات تھی۔ نزہت بار اور دلکش۔ ہر سوتہ ہجوم گل
 تھا۔ رات کی رانی کی بھینی بھینی خوشبو سے سخن چمن بسا ہوا تھا۔ درختوں کی کونپلوں
 سے کونپلوں کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔ گلاب کی نغلی اور نازک شاخیں ہزاروں
 ہزار پھولوں سے ٹھکی پڑتی تھیں
 شگوفوں سے پھولوں کی رنگت ہویدا تھی۔ پھول پھول کے کان میں راز
 الفت افشا کر رہا تھا

چاند کی سیسے کوئیں آسمانی دستوں کو چیرتی ہوئی گھنٹے گھنٹے درختوں سے
 چھن چھن کر آرہی تھیں۔ بردائے کبود پر موج نور کے قطرے ادھر ادھر بکھرے
 ہوئے تھے۔ بہار کی یہ دلنوازیاں۔ جانفزاںیاں۔ کیف پرور اور مسحور کن تھیں۔

خورشیدہ میری پیاری خورشیدہ! ہلکے پیازی رنگ کی ستارہ مثال ساڑھی
 میں ملبوس، مولسری کی لہلہائی معطر بیزروش پر جو ہی کی نغلی کلی کی طرح شرابِ انی

سے مخمور۔ میری باہوں میں اپنی نازک سیسے باہیں ڈالے محو گلشت تھی۔
مولسری کی کھلتی ہوئی خوشبودار شاخوں میں وہ فردوس بریں کی حور کھائی
دی تھی۔

میں نے کہا۔ ”میری اپنی خورشیدہ میں تہا رے لئے کچھ پھول توڑ لوں۔“
گلاب کی نیم داکیاں پیش کرتے ہوئے میں نے کہا۔
”میری نفیٰ خوبصورت تھی۔ ہماری محبت لافانی ہے۔ یہ جوان رہے گی۔“
جب تک مہر و ماہ قائم ہیں۔

وہ بجا سی گئی۔ یاسن کی مخمور کلی کی طرح۔
وہ والہانہ انداز میں زیر لب دھیرے دھیرے گیت گنا رہی تھی۔
”میرے محبوب! ہم یہاں جدا ہو جائیں گے۔ میرا راستہ اس طرف جاتا ہے۔
اور تیرا راستہ وہ ہے۔ ہم ہمیشہ کے لئے جدا ہو جائیں گے۔ میرے محبوب!
”شریہ لڑکی۔ مجھے دق کرنے کے لئے کیا یہی گیت رگیا تھا۔ ہم جدا ہو جائیں گے
میرے محبوب!“

گلستاں کی چنچل دوشیزگاں آنکھ مچولی کھیلنے میں مشغول تھیں
دور۔ پرے۔ سرور پر۔ کیو پڈ کے سنہری تیروں کے شکار دو پرندے ایک دوسرے
کو پریم سندیس دے رہے تھے۔

جو نہی یہ دردناک گیت ختم ہوا۔
ہم جدا ہو گئے۔ نہ جانے کیوں۔

کیا یہ شگون بد تھا۔ میری خورشیدہ کی جدائی کا۔
کیا یہ المانک گیت —

اس رومانِ غم کی تفسیر تھی۔ ہم جدا ہو جائیں گے۔
ہمیشہ کے لئے جدا ہو جائیں گے۔

بہار اب بھی آتی ہے۔

لالہ گلشن میں آگ لگا دیتا ہوں

بھونرناست ہو کر گلاب کے گردِ قفس کرتا ہے۔

نیتریاں۔ گلستاں کی نغمی پریاں۔

اب بھی آنکھ مچولی کھیلتی ہیں — چاندنی راتوں میں

لیکن — خورشیدہ اور میں۔

اب کبھی اکٹھے سیر کو نہیں جاتے۔

خورشیدہ کو آسمان نے مجھ سے جدا کر دیا۔

اور اب لمحات تنہائی میں — میں سوچتا ہوں۔

کیا یہ آخری گیت تھا — ”میرے محبوب ہم جدا ہو جائیں گے۔“

اکثر شب تنہائی میں ان بیتے ہوئے خوشگوار لمحات پر غور کرتا ہوں۔ تو یہ

گذری ہوئی دلچسپیاں اور انکی ناکامیاں میرے دل پر اپنا عکس ڈالتی ہیں۔

میں بے اختیار ہو کر کہتا ہوں۔

”دلِ حریں۔ وہ رات پھر کبھی نہ آئے گی۔“

جُدائی کے تیر

وہ آئے — جُدائی کے وقت — مٹنے کے لئے — گلے سے ملے اور
 جُدا ہو گئے۔ ایسے جس طرح پمیدہ سحر سے لیلے شب
 تھوڑی دُور گئے۔ اور ٹھہر گئے۔ خدا معلوم کیا سوچ کر۔
 چائے نکھیں — اُنھیں — ملیں — ان میں حسرت جھلک
 رہی تھی۔

محبت سے لبریز تھیں یہ آنکھیں — ان میں ارمان بھی تھا۔ یاس
 اور آرزو بھی۔

آنکھوں کی گنگنا جہنا سے لہریں اُٹھیں۔
 پلکوں کے قدم چوم کر طوفان بدامان آگے بڑھیں۔
 اشکوں کا سیلاب جاری ہو گیا۔
 ایسے جس طرح سادون بھادون گلے مل رہے ہوں۔

..... (۲)
 (۳)

پہیم آکاش پر — بادل چھا گئے — کابل کی طرح سیاہ

میں نے دھیرے سے پوچھا۔ ”محبوب تم جدا ہو رہے“
 ”ہاں“ اس کا جواب تھا۔ میں کھویا گیا یہ سُنکر
 میری امیدوں کی دنیا میں ایک پھل سی بپا ہو گئی۔

میں نے آہستہ سے کہا

میرے محبوب! تمہاری جدائی پر۔ میری صبح مسرتِ شامِ غم سے بدل
 رہی ہے۔

مختصر سی پریت — اور اس کا یہ انجام۔ کس قدر اندوہناک ہے یہ مال۔
 اُسکی یاد — کیا اب یادِ عشرتِ ماضی کہلائے گی۔

((۳))

تم جدا ہو رہے ہو۔ میرے محبوب۔ لیکن۔ کون جانتا ہے
 میری یہ تشنہ کام آنکھیں۔ کب دید سے سیراب ہوں۔
 یہ دل محروں دُہرائیگا۔ سکوت سے لبریز۔ کچھ تنہائی میں۔
 بصدِ حسرت و یاس۔ گزری ہوئی داستانِ محبت — دنیائے الفت
 کی رنگین کہانی۔

تم جدا ہو رہے ہو میرے محبوب
 کیا یہ دلِ حزیں نہ تڑپے گا۔ جب یہ یاد کرے گا۔ خنستانِ محبت کے ان
 ساغروں کو۔
 جن کی ارغوانی شراب نے۔ ان کو مدہوش بنائے رکھا۔

کیا یہ دل بتیغِ ارنہو گا۔ بزمِ ناز کی گزری ہوئی کہانیوں کو یاد کر کے

...((۴))...

۶۸ میرے محبوب! تم جدا ہو رہے ہو۔

ایسے جس طرح — موسمِ خزاں میں ایک کمزور زرد سا پتہ — بادِ تندہ کو اڑ کر
پانی میں بہہ کر — شاخ سے بہت دُور — بہت ہی دُور — چلا جاتا ہے۔

میرے محبوب! تم جدا ہو رہے ہو

تم خرمینِ دل پہ برقِ گرا رہے ہو۔

باغِ انبساط میں

اک نازک سے کاشانہ کو جلا کر — راکھ کا ڈھیر بنا رہے ہو۔

لیکن اے محبوب — اس دل میں — دل کی گہرائیوں میں
اس لامکاں و مستوں کے مالک — دل میں — ایک ننھا سا — مگر محفوظ

ترین کاشانہ ہے۔

...((۵))...

اس میں تمہاری یاد رہے گی — ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔

اے میرے محبوب! ہم جدا ہو جائیں

یہ تو قضا و قدر کے نوشتہ میں

روزِ ازل سے ہی لکھا جا چکا ہے — کس قدر زبردست ہے — یہ

نظامِ قدرت —

ہم جدا ہو جائیں۔ تم اور میں۔ میں اور تم
 لیکن میرے محبوب!
 فاصلہ خواہ کتنا ہی کیوں نہ ہو۔۔۔ یہ تمہاری یادوں میں حائل نہیں ہو سکتا
 وقت نے۔۔۔ بے رحم وقت نے۔ ہمارے درمیان
 حائل کر دی ہواکِ خلیج

.....(۶۶).....

جدائی کی۔ اضطراب کی۔ مہجوری کی۔
 اور ایسے میں تم جدا ہو رہے ہو۔ اے میرے محبوب
 لیکن ہر لمحہ۔ ہر گھڑی۔ ہر لمحہ۔۔۔ تمہاری یاد کا بادل
 چھایا رہیگا۔ اس دل کے آکاش پر۔
 اور میں ہر قطرہ چکیدہ کو۔ صدفِ دل میں موتی بنا کر
 اور ان کو ہر رگِ جاں میں پرو کر۔۔۔ تمہاری یاد کے ہار پہناؤں گا دل کو۔
 تم جدا ہو رہے ہو۔ محبوب
 لیکن۔ خلوص۔ محبت۔ دوستی کی یادگار سب سے زیادہ زبردست ہے۔
 تم جدا ہو رہے ہو۔ میرے دل کے مکین۔!

بیوفا سے

چاندنی رات ہے۔ میں تنہا ندی کے کنارے۔ ایک پُرانے درخت کے سایہ تلے۔ دُنیا ئے یاد میں کھویا ہوا کھڑا ہوں۔ چاند کی شوخ کرنیں اپنا نقرئی عکس صاف و شفاف پانی پر ڈال رہی ہیں۔ گویا شوخ اور چنچل پریاں ندی کی لہروں پہ رقصاں ہیں۔ موسیقی کے لامحدود چشمے اُس کی روانی میں پہناں ہیں میں اپنے دل میں ایک خامشی۔ افسردگی پارہا ہوں۔ میرا دل حزیں تلاشی ہے۔ اسی شب منور کو ڈھونڈ رہی ہیں۔ میری آنکھیں۔ شب سیہیں کے ان نظاروں کو جن سے یہ اسی ندی کے کنارے چھٹکی ہوئی چاندنی اور جگمگاتے ہوئے ستاروں میں لطف اندوز ہوئیں۔ جب میں اور خورشیدہ جیون کے ساتھیوں کی طرح مسرت کی دنیا میں۔ زندگی کے ایام بسر کر رہے تھے۔

۰۰۰ (۲۰) ۰۰۰

رات اب بھی چاندنی ہے۔ وہی نظارے دعوتِ نظارہ دے رہے ہیں۔
لیکن۔ میری۔ اے کاش میری تمناؤں کی دیوی۔ تمہیں معلوم ہوتا۔
اے کاش میری جان تو دیکھتی میرے دل کی دنیا کو۔ بیٹا ریک ہے۔
اس میں ظلمتیں ہی ظلمتیں ہیں۔ تیرے بغیر میری خورشیدہ۔

اس میں روشنی کی جان پرورا و حیات بخش شعاع اُمید کا گذر تک نہیں۔
اس میں تاریکیاں ہیں تیرے بغیر میری زندگی کی راحت نواز روشنی پر سیاہ گھٹائیں
چھا گئیں۔

تم نے مجھے بھلا دیا۔ سبجانے کیوں۔ میں نے زندگی کی چند ساعتیں جو تمہارے
ساتھ بسر کی ہیں۔

اُن کی یادوں میں اپنے دکھ بھرے جیون۔ آنسوؤں میں ڈوبے ہوئے
جیون کو گنار دوں گا۔

میں کیسے محو کر دوں۔ اُن تمام نقوش کو۔ جو میرے دل و جگر پر اپنا ایک
ایسا اثر چھوڑ گئے ہیں

جن کو مٹانا۔ فراموش کرنا۔ بھلانا میرے بس کی بات نہیں۔ تمہاری جدائی
نے

مجھے خوشیوں کی دنیا سے الگ کر دیا ہے۔ لیکن تمہاری یاد کی حسین ترین
تصویر میرے ساتھ قبر میں ہی جا کر دفن ہوگی۔

...﴿۳۵﴾...

حسن و کھشت کی مست راتوں میں۔ چاندنی راتوں میں۔ اسی ندی کے
کنارے۔ جب فضا خود در و پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو سے معطر ہو رہی تھی تنہا
وعدہ کیا تھا جب تک دم میں دم نہ ہو۔ میری ہی رہو گی۔
جگمگاتے ہوئے ستارے ہماری محبت کے گواہ تھے۔

”تم نے کہا تھا ”میرے دل پر تمہاری حکمرانی ہے۔ اس میں کوئی اور نہیں بس سکتا۔“

”یہ دل تمہارے لئے وقف ہو چکا ہے“
اوسٹنگر — بیوفا — وعدہ فراموش -

تم سے یہ کیسے ہو سکا کہ اک پاگل پریمی کو رونا ہوا چھوڑ دیا۔
جس نے اپنا شباب۔ اپنے فتنے۔ تمہاری نذر کر دیئے۔
کیا تم نے ایسا کرتے ہوئے کوئی دکھ۔ کوئی درد۔ کوئی خوف محسوس نہ کیا؟
کیا تم نے میرے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں آرزوؤں کا ایک بے پایاں سمندر نہ پایا۔
میں تم سے محبت ہی نہ کرتا تھا بلکہ ایک عقیدت مند پُجاری کی طرح پوجتا تھا
میں تمہاری محبت میں دنیا و مافیہا کو بھول چکا تھا۔

...((۴))...

اب میرے لئے اس دنیا میں باقی کیا رہ گیا ہے۔
میری زندگی میں شادمانی و مسرت کا کیا کام
مجھ سے راحتیں۔ مسرتیں۔ سمندر کی لہروں کی طرح دور بہت دور جا چکی
ہیں۔

تمہاری یاد مجھے تڑپائیگی۔ رُلائے گی۔ کپائیگی۔ بیکل بنائے گی۔ اور
میں شبنم کی طرح خاموش آنسو بہا یا کروں گا
تم ایک مسافر کی طرح میری زندگی کے باغِ شباب میں داخل ہوئیں۔

چند ساعتیں بسر کریں۔ اور چلتے وقت کیوں کو بھی مسل دیا ENA

.....(۵).....

میں دیر تک - بہت ہی دیر تک ان ہی خیالوں میں نہنک رہا۔
 یکایک پرندہ شب کی خوفناک آواز نے مجھے چونکا دیا۔
 انجم کا بکھرا سا قافلہ حرکت میں تھا۔ ماہتاب کا چہرہ بھی مضمل و نیمجاں مریض
 کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ وہ پرے - درختوں کے جھنڈ کے پیچھے جا رہا تھا۔
 تیرگی ہر سوسلط ہو رہی تھی۔ فضا اداس و لول تھی۔ ہر طرف - خاموشی -
 سکوت - اُدا سی تھی۔
 ”آہ وہ چاندنی راتیں“

”پجارجن“

~~~~~(۱)~~~~~

اک چھوٹا سا مندر ہے — اس پہاڑی کے دامن میں  
جہاں شاہ خاں رشام کو — شفق کے سندر میں غرق ہو جاتا ہے  
اک چھوٹا سا مندر ہے

~~~~~(۲)~~~~~

اُس مندر میں اک مورتی ہے — سُندر دیوتا کی
اور میں اُس کی پجارجن ہوں — اپنے دیوتا کی پوجا رن
ہر روز — سویرے ہی سویرے
جب سورج دیوتا — اپنی سُنہری رتھ میں — کرنوں کے تیر برساتا —
مشرق کی سمت سے آتا ہے۔

~~~~~(۳)~~~~~

میں غور و پھولوں کا بار پر و کر  
دیوتا کی پوجا کے لئے آتی ہوں اس مندر میں

اور پھر آنکھوں کی گنگا جمناسے جل لیکر دیوتا پر چڑھاتی ہوں۔  
جھکا دیتی ہوں اپنے سر کو۔ بڑے خلوص اور عقیدت سے۔ دیوتا کے

حضور میں

اور پرارتھنا کرتی ہوں۔ موہن کے درشنوں کے لئے  
کسی روز تو قبول ہوگی۔ میری پرارتھنا۔ مجھ ابھاگن کی  
اور میرے دیوتا۔ اپنے داسی کے گھر آئیں گے۔

# پر دیسی پیتم کے نام

سکھی !

پریم تو پردیس جا بے — میری روح کے برہم کے تاروں میں ارتعاش  
پیدا کر کے

خیال آتے ہیں اُس پر دیسی کے  
جیسے شاہراہ پر راگمیر ہوں گذرتے -  
نہ جانے کب آئیں گے — پیتم میرے  
بیت جاتا ہے دن — راہ تکتے تکتے

---

لوٹ آتے ہیں پرندے — شام کے دھند لکے ہیں —  
گھنیرے جنگل سے -

لیکن — سکھی

پیتم تو آتے ہی نہیں میرے -

رات کی تاریکی چھا جاتی ہے — ہر شے پہ  
 تیرگی ہی تیرگی — ہو جاتی ہے ہر جا  
 کھو جاتی ہوں میں — اس کے خیالوں میں — روتے روتے

---

اور اگر — نیند ہی چھا جائے

تو

خواب میں بھی تو

وہ نہیں آتے —

---

# انفک کے اُس پار

انفک کے اُس پار ایک فردوسی بستی ہے۔ جہاں مسکراتی ہوئی کرئیں۔  
 دیوق سمت درختوں سے کھیلتی ہوئی شفق کے سمندر میں ڈوبے ہوئے  
 بہرت کی بلند چوٹیوں کے پیچھے چھپ جاتی ہیں۔ اس بستی کی دلچسپیاں حسین  
 نیندوں کے دلکش خوابوں میں پھیل چکا کرتی ہیں۔ میرے دلدار  
 اُس کی نہرت بار کیف آور۔ دلشین فضا میں محبت کی رنگین کہانیاں ہرنا  
 جرم نہیں میرے دلدار۔

اس بستی میں ایام محبت ملکوتی خوشیوں میں بسر کئے جاتے ہیں۔ اسکی  
 عطر بیز فتنہ زان فضاؤں میں اودی اودی۔ نیلی نیلی، بھوری بھوری بدلیاں  
 بدبو شِ شِرابی کی طرح لڑکھڑاتی ہیں۔

اس سرزمین پر مہتاب اپنے پورے جو بن سے مسکراتا ہے اور اسکے  
 جاں نواز تمبسم کے سایہ تلے ایک نندی کبھی نہ ختم ہونے والا گیت والہانہ انداز  
 میں گاتی ہوئی بہتی ہے۔ جیسے اکثر تم گیت "تم بھی پریت کرو تو جانو" دھیرے  
 دھیرے گنگنا یا کرتے ہو۔ کسچی چغل دوشیزہ کی طرح آرام سے نہ بیٹھنے والی شوخ

لہریں اس مدھ بھری فضا میں کرفوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتی ہیں۔ اے  
میرے دلدار۔ اس پاک بستی کی فضاؤں میں معصوم موسیقی لہراتی ہے۔  
اس سرزمین پر محبت کی رنگین وکوش کہانی کو المناک افسانہ نہیں بنایا  
جاتا۔

اس جنت نظیر فردوس نکاح بستی میں طائران خوشنوا اپنے خوش ایند ترنوں  
میں نعمات الفت الاپتے ہیں۔ اے میرے دلدار

اس سرزمین پر پھول پھول سے کلی کلی سے اپنا راز محبت بر ملا کہہ دیتی ہیں  
یہی ایک بستی ہے جہاں ہر صبح شاہ خاور کی سنہری شعاؤں میں اور  
ہر شام ماہتاب کی سیوں کرفوں میں پریم کے گیت لہراتے ہیں لیکن میرے  
دلدار۔ پھر بھی اس رومان پرور بستی کا رومان مکمل نہیں۔ تیرے بغیر۔  
اؤ میرے دلدار! اس دنیا سے الگ پریم کی اک نئی بستی بسائیں۔

# جذبہ سفر

طلوع آفتاب کا نظارہ مشرق کی سمت  
 بحر بیکراں مغرب میں  
 مشرق و مغرب کے نظارے مجھے اپنی جانب بلارہے ہیں۔  
 یہ سفید سڑک کدھر جاتی ہے — وہ نیلی پہاڑیاں کہاں ہیں؟  
 لیکن سورج اور ستارے میری رہنمائی کریں گے  
 وہ افق سامنے دکھائی دیتا ہے  
 ہر روز نئے اور پرانے جہاز وہاں آتے ہیں۔  
 ممکن ہے میں واپس آ جاؤں۔  
 لیکن اب میں یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔  
 اگر تم سے کوئی پوچھے کہ وہ کہاں ہے؟  
 گو کہنا — کہ نیلگوں آسمان — بحر بیکراں —  
 یہ ننھے ننھے ستارے — یہ سرسبز پہاڑیاں  
 اس کے ذمہ دار ہیں۔

لیکن اب یہ نظارے مجھے اپنی جانب بُلارہے ہیں  
الوداع !

(ترجمہ)

---

# مسافر

میں غمزدہ بادلوں کے برفانی تو دوں کی طرت دیکھ رہی تھی  
 سرد سرد ہوا سائیں سائیں کر کے چل رہی تھی۔ ایسی سرد جیسے بیوفادوستونکی  
 سرد مہری۔  
 کسی نے دھیرے سے آکر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”سکھی کوئی مسافر  
 آیا ہے۔“

میں نے سنا اور چونک اٹھی۔ جیسے بادِ شند میں گلاب کی نغلی نغلی کوئلیں  
 میں نے کہا۔ اُس سے کہو میرے کاشانے کو منور کرے۔

---

وہ ایک بھولا بھالا نوجوان تھا۔ اُس کے گلابی لبِ شبنم تھے۔  
 میں نے کہا ”مسافر ٹھنڈا پانی پیو گے۔“

اس نے ہولے سے سر ہلا دیا۔ میں نے اُسکے پاؤں دھلائے  
 پھر چاندی کے کٹورے میں ٹھنڈا پانی پلایا۔  
 ”کس دلیس سے آرہے ہو مسافر۔“ میں نے پوچھا

”بڑی دُور سے۔ بہت دُور سے۔ وطن کو چھوڑ کر۔ بے وطن ہو کر“

”کیسا ہے تیرا دس۔ مسافر  
اُس کی ریلی آنکھیں پر نم ہو گئیں۔ ہلکے ہلکے سُرخ رخساروں پر گرم گرم قطرے  
ڈھلک پڑے

”میرا دس فردوس کی مانند ہے۔ پھولوں پر بلبلیں نغمہ ریز ہیں۔ باغوں  
میں طوفانِ حسن و جمال بہا ہے۔ اس کے دریا برفانی پہاڑوں سے آتے  
ہیں۔ اُن کی لہریں سیلاب کی طرح بے قرار ہیں۔ میرے دس کی میٹھی فضاؤں  
میں موسیقی رقص کرتی ہے۔

گھنے درختوں کے سایہ تلے۔ ٹھنڈے رواں چشموں میں۔ ننھے ننھے بچے  
کاغذ کی ننھی ننھی ناؤ تیرتے ہیں۔  
مسافر اتنا کہہ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ ”کہاں جاؤ گے مسافر“ — جہاں قسمت  
لے جائے۔“

میں نے کہا ”مسافر۔ تو نے میرا دل موہ لیا ہے۔ تیرے پاس ہونہی ہے“  
وہ وطن کی یاد میں رو رہا تھا۔

اور میں اس کی جُدائی سے بیتاب ہو کر رو رہی تھی۔ ایسے جس طرح سالوں  
بھادوں کی جھڑپوں میں دریا کی لہریں پروانہ وار ساحل کے قدم چومنے کو بے قرار  
ہو کر دوڑتی ہیں۔

لیکن آہ ! وہ الوداع کہہ کر چلا گیا —

# ساجن کی یاد

ساجن! تم نے مجھے کیوں بھلا دیا۔  
 میرا دل۔ تمہارے فراق میں بروگ کے گیت گارہا ہے۔  
 میری تشنہ دید آنکھیں پرورہی ہیں مالا۔ آنسوؤں کی۔  
 تم نے مجھے کیوں بھلا دیا ساجن۔  
 نہ جانے میری یاد کیوں اتر گئی۔ تمہارے دل سے۔  
 میں کھو یا کھو یا سارہتا ہوں۔ تمہاری لطیف یادوں میں۔  
 وہ نادان پوچھتے ہیں ”تم اُداس کیوں ہو — نہ جانے تمہیں کیا ہو گیا“  
 لیکن انہیں کیا معلوم — مجھ کو بھلا دیا۔ میرے ساجن نے

۲

میری دنیا تاریک ہو گئی۔  
 اُس پر تمہاری آنکھ ایسی سیاہ گھٹائیں چھا گئیں  
 میرے ساجن۔ نہ جانے تم نے کیوں بھلا دیا۔ مجھ حرام نصیب کو  
 مجھ سوختہ اختر — بد نصیب کو

مٹھاری اس بھول نے۔ میرے کاشانہ راحت کو۔ غمنا نہ بنا دیا ہے  
مٹھاری یاد نے میری تمام راحتوں کو سمیٹ لیا ہے  
ایسے جس طرح بھونرا کلی کلی کارس چوس لیتا ہے۔

مٹھیں معلوم ہے۔ میرے ساجن  
اس کے صلہ میں مجھے کیا ملا۔

کرب۔ درد۔ سوز۔ آہیں۔ نالے کسک۔ ترپ۔ الم۔ یاس۔ بقراری۔

مجبوری۔ اضطرابی۔ ہمیشہ ستانے والی یاد۔

۵۶ مٹھارا وعدہ کیا تھا۔ ایک سُر اب۔ ایک فریب تھا۔ دلفریب  
جس کی یاد سے میری آرزوئیں دھڑکتی رہ جاتی ہیں۔

محبت کی اُن حسین راتوں میں کتنی لکشی کتنی رعنائی تھی۔  
وہ تو فردوس کے دلکش خواب تھے

میں کھویا گیا ہوں۔ ان کی یاد میں

مجھے خبر ہی نہیں۔ دنیا کی۔ دنیا کے باسیوں کی

میں دل کی کشتی کو۔ یادوں کی لہروں پر چھوڑ دیتا ہوں۔ اور یہ بڑھی

جاتی ہے۔ اس بحر بے پایاں میں۔

اس کی راہ میں کوئی چیز حائل نہیں۔

میری یادیں آزاد۔ بیفکر ہوتی ہیں۔

۔ ہوا کی طرح

یہ آزاد ہیں۔ گیت کی طرح  
 کتنی شیریں۔ کتنی دلکشی۔ کتنی دلفریبی۔ کتنی رعنائی ہوئی ہر محبت میں  
 لیکن ساجن۔ محبت کتنی اذیت دہ ہے  
 محبت کس قدر تکلیف دہ ہے  
 یہ کون جانے ؟

گذری ہوئی محبت — الفت رفتہ کی یاد  
 یہ آگ بھی سرد نہیں ہوتی۔  
 اسکو آنسو بھی نہیں بجھا سکتے۔

یہ شعلے بھڑک اُٹھتے ہیں۔ آنسوؤں سے  
 تم نے مجھے کیوں بھلا دیا؟ — کیوں فراموش کر دیا؟  
 لیکن تم اپنی یاد۔ مجھ سے نہیں چھین سکتیں۔  
 میں نے تمہاری یاد کو — میری خورشید  
 میں نے تمہارے خیالوں کو میری خورشید  
 بٹھالیا ہے دل کے سنگھاسن پر

اور اُسے پوج رہا ہوں — ایک دیوی کی طرح  
 کاش کہ میں — انہی یادوں۔ ان ہی خیالوں میں  
 کھو جاؤں۔ گم ہو جاؤں۔  
 تمہاری یاد میں میری روح

آزاد ہو جائے — زندگی کی قید سے -

میری خورشیدہ -

کیا یہ یادگار نہ ہوگی — تمہاری یاد کی -

ایک زندہ جاوید یادگار — ابد تک

نہ جانے — میری خورشیدہ — تم نے مجھے کیوں بھلا دیا -

۴۴

# مجھے محبت ہے

محبوب! مجھے محبت ہے — بے پناہ محبت  
 آسمان پر مسکراتے ہوئے چاند کی سیسوں کر نوں سے  
 محبوب! مجھے محبت ہے  
 شفق کی رنگینیوں سے۔ جو عکس ریزہ ہوتی ہیں۔ ندی کی تھر تھرائی لہریں  
 محبوب! مجھے محبت ہے  
 یاسن کے سفید اور نازک پھولوں سے  
 جب وہ کہتے ہیں راز محبت۔ جھک جھک کر ایک دوسرے کے کانیں  
 اور بادِ سحر کے جھونکے صُبح دم جھلاتے ہیں۔ جھولا ان کو۔  
 محبوب! مجھے محبت ہے — بے پناہ محبت  
 دل کش گلاب سے  
 اسکے کنج میں کھوجاتا ہوں — کسی کے حسین تصور میں۔  
 محبوب! مجھے محبت ہے۔  
 لالہ کے سرخ سرخ پھولوں سے

اسکا داغ جگر دیکھ کر تڑپ اُٹھتا ہوں  
یاد آتا ہر جسم جگر اپنا  
محبوب! مجھے محبت ہے  
زگس کی مستانہ آنکھوں سے۔ یہ سراپا انتظار ہیں کسی کے انتظار میں۔  
محبوب! مجھے محبت ہے۔  
ان تمام سے زیادہ — بہت ہی زیادہ  
تمہاری مسکراہٹ سے۔  
محبوب! تمہارا یہ تسم — جو قصاں ہوتا ہے  
تمہارے گلاب کی پتیوں ایسے نازک ہونٹوں پر۔

---

# دیارِ حبیب میں

دیارِ حبیب میں — تمناؤں کا — آرزوؤں کا — راک  
طوفان لیکر گیا تھا میں ۔

بیعتِ رُہورہ تھا دل — ان کی دید کے لئے — آنکھیں پاییں  
تھیں ۔ اُن کے حُسنِ منیا بار کی اک تابش کی  
لیکن ۔ انھوں نے

توڑ دیا — میری اُمیدوں کے کھلونوں کو  
بڑی بیرحمی سے ۔ گر ادیا ۔ میری اُمیدوں کے ریت گھر وندے کو  
اک اُن کی اُن میں

اُجڑ گیا — میرا باغِ اُمید

پل بھر میں — مڑ جھاگئیں ۔

تمناؤں کی کلیاں — کھلنے سے پیشتر

دردِ دیوار پر حسرت بھری اک نظر ڈال کر  
 دل میں طوفانِ تیش لائے  
 اِن ظالم آنکھوں نے لگا دی -  
 جھڑی آنسوؤں کی  
 اُن کے جلووں سے محروم ہو کر

---

# پیامن کی آس

آسمان پر لکھائے ابر دھیرے دھیرے اس کی بیکراں پہنائیوں کو پیرتے  
ہوئے بکب کی طرح خراماں خراماں جا رہے تھے۔

طیورنمات محبت الاپ رہے تھے۔ ابا بیلوں نے جھومر ڈال کھاتھا۔  
ہوا آوارہ پھر رہی تھی۔ خوشبوئیں چل رہی تھیں

سبزہ مہک رہا تھا۔ کس قدر صبر شکن تھا یہ نظارہ۔ بدبوئیں کن مستی۔  
بجلی کی چمک۔ بادل کی کڑک۔ نھنی نھنی بوندیں۔ بوجھاڑ۔ موسلا دھار  
جل تھل۔ پانی۔ آتاہ ساگر کی طرح۔

سادن بھادوں گلے مل کر رو رہے تھے۔ سڑک پر ناگن کی طرح بلکھاتی  
ہوئی ہنگامی ندی

---

میں اور خورشیدہ باغ کی بارہ درمی میں برسات کا یہ دلنواز منظر شاہ  
فطرت کی دلنوازیوں۔ جانفرازیوں۔ اور دلفریبیوں دیکھنے میں مصروف تھیں۔

---

ہم کھوئے گئے تھے۔ اس مدد بھری فضاؤں میں۔  
 ہم بسا رہے تھے۔ اپنے من میں محبت کی اک نئی بستی۔  
 لیکن اب۔ سادون کی رُت۔ میں میرے لئے وہ کیف نہیں۔  
 میرے من میں برہا کی آگ لگی ہوئی ہے۔  
 میرے دل پر سادون کی گھنگور گھٹاؤں سے بھی زیادہ  
 کاری کاری بدریاں چھائی ہوئی ہیں۔  
 اور میری آنکھوں نے خورشید کی جدائی میں  
 سادون بھادوں کی طرح جھڑپاں لگا رکھی ہیں۔  
 میری ہمیشیں — میری خورشید  
 مجھ سے جدا ہے  
 پردیسی پر تیس۔ کا خیال۔

تنہائیوں میں یا کسی رشک حور کی  
 بھولی ہوئی وصال کی رات کو کر کے یاد  
 غلی سی ایک روہنشا ط و سرور کی  
 فطرت کو بھیک مانگ رہا ہوں سرور کی  
 طبعزاد

## نغمہ محبت

ایک شب میں نے اک فرشتہ کو نغمہ محبت گاتے ہوئے سنا  
یہ نغمہ اس قدر دلکش تھا کہ میں کہکشاں - اور ستارے بخود ہو کر اسے سُن  
رہے تھے۔

حتیٰ کہ اسرافیل بھی اپنا سر پروں میں دبائے اسے ہم تن گوش ہو کر سُن رہا  
تھا۔

نغمہ ہوئے ہوئے فضا میں بھرتا جا رہا تھا۔  
یہ نغمہ محبت تھا۔ دلکش و کیف نواز  
لیکن مجھے یاد پڑتا تھا۔ جیسے یہ نغمہ اس سے پیشتر سُن چکا ہوں۔  
مجھے یاد آیا۔

دوزخ کی گہرائیوں میں۔ تحت الثریٰ میں۔ اس فضا سے بجی میں  
نامرادی کی اک تصویر۔

اک زرد زو۔ دکھیا رمی روح نے اسے الاپا تھا۔ یہ اس قدر غم آگیز۔  
یاس آمیز تھا۔ کہ تمام دکھی روہیں اسے سنکر ہائے ہائے کر رہی تھیں۔

ابلیس ابھی تاریک و مہیب فقر بیکراں میں اپنے بازوؤں کی پوری سکت  
کے ساتھ منڈلاتا ہوا اسے سُن رہا تھا۔

یہ سوز بھر اگیت بھی

نغمہِ محبت تھا۔

لیکن دونوں روئیں جھٹھوں نے اسے الاپا۔

نامرادی۔ یاس و حرماں کی تصویریں تھیں۔

ماخوذ

# کوئل

میں نے رات کے پرسکون لمحات میں کوئل کی کوک سُنی اور میری دیکھی ہوئی  
روح نے یہ آنسو صفحہ قرطاس پہنچ کر دیئے  
”پگھلی کوئل کا ہے کوک سُنا۔“  
اے کوئل! تجھے قسم ہے اپنے محبوب کی  
”کوکو“ کا نعمتِ فراق نہ الاپ  
تیرا یہ سوز و گداز سے بھر پور گیت  
میرے دل کی انتہا گہرائیوں میں اتر رہا ہے۔

اے کوئل - پریم پُرجارن -  
تیری کوک - ماضی کے افسانوں کی یاد دلاتی ہے -  
اور یاد کی کسک دل میں پیوست ہو جاتی ہے -

اے کوئل تجھے قسم ہے اپنے محبوب کی -

”تو کو کو کر کے - سہاگ کی سہانی راتوں کی یاد نہ دلا -  
تیری ”لوک“ سُنتے ہی میرے دل میں اک ہوک سی اُٹھتی ہے -  
آنسو - آنکھ کے دریچے سے جھانکنے لگتے ہیں -

---

اے کوئل! کتنی نادان ہے تُو  
باوری! کبھی اپنے ساجن کو بھی  
تیری طرح بدنام کرتے ہیں -  
قسم ہے تجھے محبوب کی - سوز بھرے نغمے نہ الاپ  
کہیں دل خون ہو کر نہ بہ جائے -

---

# ”مانجھی“

مانجھی! علی الصباح تم نے دھیرے سے کہا تھا۔  
 ”ہم دونوں کشتی چلائیں گے اتھاہ ساگر میں“  
 ”دنیا کی اور کوئی روح باخبر نہ ہوگی۔ ہماری منزل سے کبھی بھی

اس بحر بے پایاں میں — سفینہ کھیتے کھیتے  
 میں گاؤں کی منوہر گیت — محبت کے  
 جوناپس گے سمندر کی سرکش لہروں کے ساتھ۔  
 یہ ہوں گے آزاد — الفاظ کی قید سے  
 ہماری کشتی ہوگی رواں — تیز زو لہروں کے سینے پر  
 مانجھی!

کیا آیا نہیں وہ لمحہ ابھی  
 کیا دنیا کے دھندے نہیں ختم ہوئے ابھی۔  
 شام کی سیاہی پھیل رہی ہو سُرعت سے سمندر کی لہروں پر

پُر کیف دُھندلے میں جا رہے ہیں بچھی  
اپنے آشیانوں کی سمت ۔

مالک جانے  
کب ٹوٹیں گی یہ زنجیریں ۔  
اور کشتی ہماری — سورج کی آخری شعاع کی طرح  
ہو جائے گی گم — رات کی تاریکیوں میں ۔

( ٹینگور )

# اُداس پرندہ

نا آشنا ہے بہار — بیگانہ سکوں  
 تنہا پرندہ — ماتم کناں ہے اپنی کھوئی ہوئی محبت پر  
 بیٹھا ہے — خزاں رسیدہ درخت کی شاخ پر  
 محو فساں ہو — غمناک پرندہ — اپنی کھوئی ہوئی محبت پر  
 نا آشنا ہے بہار — بیگانہ سکوں

تنہا پرندہ .....  
 جنگل پر چھپا یا ہے — افسردہ سکوت  
 باد خزاں کے تند جھونکے — بنا رہے ہیں اُداس ماحول کو  
 برا رہی ہے فضا کو  
 دُور سے آتی ہوئی پون چکی کی صدا  
 عالم بیچارگی میں  
 سکون نا آشنا طائر  
 گردش ایام کا مارا ہوا  
 ماتم کناں ہو کھوئی ہوئی محبت پر

# مجھے یاد نہ آ

اے دوست ! مجھے تو یاد نہ آ  
 میری بیقراریوں میں - میری اضطرابوں میں - اضافہ نہ کر  
 اے دوست ! مجھے تو یاد نہ آ

کتنا نادان ہوں  
 تجھے اپنا بنا کر بھی — اپنا بنا نہ سکا  
 بھولنا چاہتا ہوں تجھے — بھلا نہ سکا  
 اللہ مجھے ترپاؤ نہ — اللہ مجھے کلپاؤ نہ — اللہ مجھے ستاؤ نہ  
 بار بار مجھے یاد آؤ نہ  
 اے دوست مجھے تو یاد نہ آ۔

جب اکاش پر تارے نکلتے ہیں — جب باغونیں غنچے ہنستے ہیں۔  
 جب چاند لگن اور دھرتی پر نور برساتا ہے۔ جب پہاڑ شور مچاتا ہے۔

ایسے میں تم یاد آتے ہو۔  
اے دوست مجھے تو یاد نہ آ

---

جب ہر چیز پہ — لمبی لٹیں چھا جاتی ہیں  
جب ہر چیز پہ — سرو ہوائیں زور دکھاتی ہیں۔  
ایسے میں تم یاد آتے ہو۔  
من میں برہا کی آگ لگاتے ہو  
اے دوست مجھے تو یاد نہ آ —

---

# ایک خط بھولنے والے کے نام

بھول گئے ..... دوست

اتنی جلدی۔ کیا اسی بات پر دوستی کا دعویٰ تھا۔ اس بھول جانے پر اتنی

جلدی فراموش کرنے پر

تمہیں یاد ہوگا ..... دوست ..... تم نے کیا کہا تھا۔

”میں نہیں بھولوں گا“ ..... کیا وعدہ وفائی اسے کہتے ہیں۔

میری بات یاد ہوگی ..... شاید تمہیں — میں نے کہا تھا۔ لفظ محبت

عام الفاظ سے بہت زیادہ معانی رکھتا ہے۔ ..... ہم .....“

اور تم نے کہا تھا۔ ”نہیں ہرگز نہیں — ہم دوست ہیں بہترین دوست“

بھولکر بھی یہ الفاظ زبان پر نہ لاؤ یہی کہا تھا تا تم نے — دوست۔

یاد کرو ان باتوں کو۔ میں نے تمہیں خط لکھے — لیکن — مجھے

جواب سے نہ نوازا گیا۔ میرے دوست وہ کون سی چیز ہے جو تمہیں خط کا جواب

نہ دینے پر مجبور کرتی ہے۔ کیا دشواریاں ہیں جو تمہاری راہ میں حائل ہیں۔

کیا مجھے خط سے بھی محروم رکھا جائیگا۔ کب تک .....

میرے دوست! تم نے فراموش کر دیا  
ایک ہمد کو — دوست کو  
میرے دوست — ایک ادا اسی چھائی ہو تمہارے بغیر۔ میرے وطن کی نفاذ

میں

لیکن — تم ان تمام باتوں کو فراموش کئے بیٹھے ہو  
ہم میں ہی تھی نہ کوئی بات یاد نہ ملو آسکے  
تم نے ہمیں بھلا دیا ہم نہ مگر بھلا سکے

# پر دیسی ساجن سے

ساجن !

یہ تو خوشی ہے میری  
تمہارا انتظار کرنا — تمہاری راہ دیکھنا

---

ساجن !

میں سراپا انتظار ہو کر — راہ دیکھتی ہوں تمہاری  
اس سٹ براہ پر۔ جہاں سایہ تعاقب کرتا ہے روشنی کا  
برکھارت آتی ہے — موسم گرما کے آغاز میں۔

---

ساجن !

پہنچی آتے ہیں — تمہارا سندیش لئے  
پیام دیتے ہیں — اور جو جاتے ہیں ادھبل نظروں سے

---

ساجن !  
 صبح سے شام تک  
 طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک  
 میں راہ کھتی ہوں تمہاری  
 یہ سوچ کر۔ اک لمحہ ایسا بھی آئیگا۔  
 جب آئیں گے ساجن میرے

---

میں مسکرتی ہوں۔۔۔ گیت گاتی ہوں  
 تمہاری یاد میں۔۔۔ اکیلی بالکل اکیلی  
 لیکن کب آؤ گے۔۔۔ ساجن

---

(ٹیگور)

# راجہ اور بھکاری

ساجن !

تم دیارِ حسن کے شہنشاہ ہو

اور

میں پریمِ نگرِ مئی کا ایک بھکاری

ساجن !

تہارے ایوانِ عشرت کے مینارِ آکاش کی لالائہا و مستوں کو چوم رہے ہیں۔

اور

میں تمناؤں کے ایک ننھے سے ریت گھروندے کو برباد کر چکا ہوں

ساجن !

تم پریم کے ساگر سے کب کے پار اتر چکے ہو۔

اور

میرے کشتی جیون لہروں پر ہر لمحہ جھکولے کھا رہی ہے۔

ساجن ! تہارے ایوانِ محبت میں ہر شب چراغاں ہوتا ہے۔

اور

میری جھونپڑی میں ہر طرف ظلمات ہی ظلمات تیرگی ہی تیرگی ہے۔  
 ساجن! تمہارے ایوان سے محبت پاش-کیف بار- مدد بھرے نغے  
 فضاؤں میں تھرکتے ہیں۔

اور

میری جھونپڑی سے اک مدھم سی مجروح آواز سنائی دیتی ہے  
 جیسے کوئی دھکی روح شدت غم سے سسکیاں لے رہی ہو  
 ساجن! کتنا فرق ہے۔  
 اک راجہ اور بھکاری میں

---

## وہ رات.....!

جب آگینہ دل کسی کی صہبائے الفت سے معمور ہو تو کیف حیات حاصل ہوتا ہے

لیکن جب یہ ساغر ہی ٹوٹ جائے تو .....  
 جب کلیاں ہی مرجھا جائیں تو پیہلوں کی آرزو کیسی —  
 زندگی بھر میں شاید ایک ہی رات .....  
 جس دن وہ آئے تھے — لیکن وہ رات پھر نہیں آئیگی۔  
 ہر روز سورج مشرق سے طلوع ہو کر مغرب میں غروب ہوگا  
 گرمی کے بعد سردی — سردی کے بعد گرمی  
 خزاں کے بعد بہار — بہار کے بعد خزاں  
 کلیاں مسکرائیں گی — پھول کھلیں گے — اور مرجھائیں گے۔  
 بلبل ان کے غم میں آہ و فغاں کرے گی  
 خزاں اپنے دامن میں بربادیاں لیکر آئے گی  
 گلشن کی پتی پتی شاخ سے مرجھا کر جدا ہو جائے گی

لیکن وصال کی وہ رات پھر نہیں آئے گی  
 بہار کی ہلکی ہوئی رات تھی۔ چاند آسمان پر نور برسا رہا تھا۔  
 میرے پہلو میں میرا چاند ضیا ہا رہا تھا۔  
 میری خوشیدہ جلوہ ریز تھی۔  
 شباب آلود فضا میں حُسن کی تابشیں تھیں۔  
 جب میں نے اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔  
 تو آکاش پرستاروں نے سرگوشیاں کرنی شروع کر دیں۔  
 دل کے مجید سکون کا دیوتا۔  
 مسرت و شادمانی سے مسکرا رہا تھا۔

آہ! وہ رات  
 اسکو بیتے کتنی لمبی راتیں گزر چکی ہیں۔  
 کیا وہ رات پھر نصیب نہ ہوگی  
 آہ! وہ لمحے پھر نہ لوٹیں گے۔ کیا وہ کیف نہ گھڑیاں پھر نہیں آغوش میں  
 نہیں گی

دلِ حزیں اس کی یاد میں بیقرار ہے۔  
 زندگی۔ آنسوؤں کے لئے وقف ہو چکی ہے۔

# آدیار

میرے دل کی ملکہ خورشید  
 بسدنا زوادی آئی  
 نسیم صبح کی طرح  
 جب سحر کا آتش نواغنی بجارہا تھا رباب  
 ایسے میں آئی  
 جلو میں جلوں کی تابشیں لئے ہوئے۔  
 کنول ایسے نین میں  
 چھلک رہی تھی شراب جوانی  
 اس کے گھنیرے سیاہ بال لہرا رہے تھے  
 سانپوں کی طرح۔ باد مشکبو میں  
 اُسکے انار کی کلیوں ایسے ہونٹوں پر  
 تبتم رقصاں تھا۔  
 آرزوئیں بیدار ہو گئیں۔ ان کو دیکھ کر

پوری ہو گئیں — شیریں خوابوں کی تعبیریں  
 کھل گئیں تناؤں کی نوریں کلیاں  
 دیکھ کر اُن کے جلووں کی تابشیں

---

# نالہ دل

بیت گیا ہے دن دکھ بھرا

رات بھی آتی ستانے

خوشی نصیب میں نہیں  
غم ہے میری زندگی —————  
پھر اکبوں آنسو بہانے  
ساغر حیات سے اک قطرہ گرا  
عنم کا اک لمحہ کم ہوا

جل رہا ہے زندگی کا چراغ  
تند ہوا میں موت کی

کیوں؟ آتی نہیں بھجانے — مالک جانے

کھلے ہیں زندگی کے در بھی

پڑا ہے متاع زلیست —————  
کاش آجائے کوئی اسے چرانے  
من میں اک ہوک سی اٹھی —————  
یاد آئے پچھلے زمانے  
تیرے بغیر میری زندگی —————  
جیسے اُجڑے ویرانے

عشقم

# یہ آنکھیں

من موہن - تمہاری آنکھوں میں کئی رس بھرے گیت بھرے ہیں -  
مجھے اجازت دے — میں ان گیتوں میں کھو کر ایک مدھر گیت بن جاؤں -

من موہن تمہاری آنکھیں  
شراب و کیف کے دو اتھاہ ساگر ہیں  
مجھے اُن سے جی بھر کے بادۂ الفت پینے دے  
تاکہ خمارِ محبت سے مخمور رہوں  
من موہن — تمہاری آنکھیں  
پریم ساگر کے دور رس بھرے کنول ہیں -

مجھے اجازت دے کہ میں بھنورا بن کر ان سے پریم رس چوس لوں -  
من موہن تمہاری آنکھیں -

پریم مندر کے دور روشن جھروکے ہیں -  
جن سے پریم کی روشنی چھن چھن کھاتی ہے -  
میرے من موہن بھتیس سو گند ہے ان نشیلی آنکھوں کی -  
ان نینوں کو جھپک کر دنیا کو تہ و بالا نہ کر

# راہی

شام کا دُھند لکا چھا رہا ہے

ہرمت

بامِ گردوں پر شفق کی سُرخیاں

رقصاں ہیں۔

اک لا اُبا لی انداز میں

پرندے لوٹ رہے ہیں

اپنے اپنے آشیانوں کی طرف

فضائیں اک سکوت ہے چھایا ہوا

اُجڑی ہوئی ہیں راہیں ساری

سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی۔

پگھلنے لگی ہے

جار رہا ہے

دھیرے دھیرے

سر جھکائے — ایک راہی

# اجنبی دس کے باہی

موت کے دس میں — چلدی

تن تنہا - نفعی میری

لجے بھوے نہیں ۱

وہ ابھی

کھیل چھوڑ کر

دوڑتی ہوئی

جب وہ آتی تھی

چوم لیتا تھا میں بیخود ہو کر

اس کے سُنہرے بالوں کو

پٹ جاتی تھی وہ

فرط محبت سے

اور ظالم موت

تو کتنی بیدا گر ہے۔  
 چھین لیتی ہے۔ اُنھیں  
 جن کو ہم پیار کرتے ہیں  
 مصروف ہیں کھیل میں۔ منہ سے بچے  
 اب بھی۔ لیکن۔ کوئی کھیل چھوڑ کر  
 پیک کر میری جانب آتا نہیں  
 وہ۔۔۔ جس کی دُور سے آتی ہوئی صدا  
 نغمہ سے زیادہ شیریں تھی  
 اب وہ صدا کبھی نہ آئے گی۔۔۔ آہ اجنبی دیس کے باہی

# چاند

چاندنی راتوں میں - آوارہ چاند  
اپنی سمیں کشتی کو کھیتا ہے  
ستاروں کی زبانی — معلوم ہوا ہے -  
کہ وہ کسی مخفی خزانہ کی تلاش میں ہے -

لیکن یہ نہیں  
بلکہ وہ کرنوں کی دیوی کی جستجو میں  
آسمانی ندی کے نورانی طوفان کی پروانہ کرتے ہوئے  
ہر چاندنی شب کو اس کی تلاش میں نکلتا ہو -  
لیکن — افسوس

صبح کے قریب  
جب کرنوں کی دیوی  
اپنے حُسنِ تاباں سے دنیا کو نور کرتی ہے -  
چاند کی بلوریں کشتی آسمان کے نیلگوں سمندر میں ڈوب جاتی ہے -

# مُسافر

”مُسافر! کیا تم جا رہے ہو۔“

ہاں!

اتنی جلدی۔

جب جانا ہی ہوا

تو پھر جلد اور دیر کا سوال کیا؟

تم جانو۔

میں تو دیر تک تنہا ہی راہ دیکھتا رہا۔

شکریہ!

کا ہے کا

تنہا ہی تکلیف کا

کیا جاؤ گے؟ — ہاں!

سچ مج

کیوں؟

مجبوری

یہ بندھن توڑے نہیں ٹوٹتے  
لیکن اگر تم چاہو تو۔  
نہیں یہ میرے بس کی بات نہیں

تم جا کہاں رہے ہو؟  
جدھر تقدیر لے جائے۔

تقدیر!

ہاں!

خوب۔ تم تقدیر کے تابع ہو۔  
یشک

اور تقدیر تمہاری تابع کیوں نہیں۔

ایسا ہو نہیں سکتا

ایسا ہو سکتا ہے

تمہاری بھول ہے۔

تم اسے سمجھ نہیں سکتے۔

مسافر! کیوں روٹھ گئے؟

نہیں -

اپنے دل سے پوچھو

پوچھ لیا -

بدل گئے

کون — تم

تم یا میں

نہیں میں تو نہیں بدلا

اور میں بھی نہیں

غلط فہمی

کس کی ؟

تمہاری

اگر مجھے خبر ہوتی

کس کی ؟

اس لمحہ کی

کسی کو بھی آئندہ کی خبر نہیں

اور اگر تم واقف ہوتے تو پھر کیا ہوتا ؟

میں محبت نہ باتا دل میں

کس کی؟ — تمہاری!  
 اب مجھ سے یہ دُکھ سہا نہیں جاتا  
 کیسا دُکھ — ؛  
 یہی دُکھ  
 تو پھر نہ سہو —  
 لیکن تمہیں کیا خبر — مجھے یہ دُکھ سہنا ہی پڑیگا  
 عادی ہو جاؤ گے

اچھا  
 ہاں  
 پروانہ دیکھا ہے  
 کئی بار  
 شمع سے اسکو لگن ہے  
 جب شمع جلتی ہے  
 یہ اس پر فدا ہو جاتا ہے۔  
 دوست !

محبت میں جان کی قربانی دینی پڑتی ہے

سب کو اپنوں سے  
جڑا ہونا پڑتا ہے  
بھورے کو پھول سے  
پھول کو عندلیب سے  
چاند کو چکور سے  
اور چکور کو چاند سے  
مسافر!

ہاں !  
جاتے وقت ایک التجا قبول کرو  
کہو !

مجھے ان گورے گورے ہاتھوں کو چوم لینے دو۔  
کیوں ؟

اس لئے کہ تم جا رہے ہو  
ارے یہ تم نے کیا کیا ؟  
تمہیں چوم لیا — بیتاب ہو کر۔  
پردیسی کو

پیارے دوست کو  
پردیسی کو — الوداع — خدا حافظ

# نغمہ حیات

زندگی !  
 اک گیت ہے  
 ابدی و سرمدی  
 کیف آگیں

ترنم رینہ  
 زندگی !  
 اک گیت ہے  
 مدھر گیت  
 مسوہ کن

پھولوں کی ہنک سے بھی زیادہ لطیف -  
 گم - اک لمحہ آتا ہے - ایسا  
 جب سراپا سوزن جاتا ہے یہ  
 اسکا ترنم ہو جاتا ہے بے اثر

ریلی تانیں — آنسوؤں آہوں میں بدل جاتی ہیں  
 بساط روح پر اضطرابِ سیم طاری ہو جاتا ہے  
 اٹھتی ہیں دل میں غم و الم کی لہریں  
 روح اسیرِ غم ہو جاتی ہے  
 آہ۔

دوسرے لمحے کچھ بھی نہیں  
 زندگی کا منہ ہر گیت بن جاتا ہے اک بھولا بسرا سپنا

---

# ”رومال“

ہمنشین ! مت چھین  
یہ رومال میری پارینہ داستانِ محبت کا اک نمایاں باب ہے۔  
تو اسے نہ چھین۔

یہ میری بیٹابی — بیکلی میں اضافہ کرے گا۔

نذیم ! تو صرف یہ پوچھ  
”تمہیں کیس نے نوازا“

یہ اک خوشچمکاں داستانِ ہر دوست — ایک المناک فسانہ

جب میرے لئے دنیا جوان تھی

اُن دنوں محبت کا فسانہ دہرایا گیا تھا

یہ رومال اس بیٹی ہوئی محبت کی یادگار ہے۔

عید کا دن تھا — یومِ مسرت تھا۔

یہ تحفہ اُسدن — مجھے بارگہ ناز سے عطا ہوا تھا

یہ بہت سے پوشیدہ رازوں کا رازِ داں ہے۔

لیکن کتنا وفادار — آج تک ایک حرف بھی زبان سے نہیں کہا۔  
 اس میں ہجر کی راتوں کی دلدوز آہوں کا طوفان ہے۔  
 اس میں جدائی کی بتیاب گھڑیوں کا سیلاب اٹنک ہے۔  
 اس میں رم بھم برسنے والے آنسوؤں کے بادل اور شر بار آہوں کی  
 بجلیاں خوابیدہ ہیں

ہاں ہمنشیں تو اسے نہ بھین۔  
 تو اسکے خون کو تو ایسے سُرخ رنگ پر محو حیرت کیوں ہے  
 دل نے فرق کی کہانی  
 اشکوں کی زبانی سنائی۔  
 وہ اشک خوں اس میں جذب ہو چکے ہیں۔  
 اس لئے ہمنشیں — یہ طوفان برق و باراں میرے پاس ہی رہنے  
 دے۔

تو پوچھتا ہے — یہ چاک چاک کیوں ہے  
 تو یہ کیوں نہیں پوچھتا — میں دل شکستہ اور چاک گریباں کیوں  
 ہوں۔

یہ اور میں  
 میں اور یہ محرم ہو چکے ہیں ایک دوسرے کے  
 ہمنشیں! کتنا نادان ہے تو

کہتا ہے — یہ دریدہ اور چاک کیوں ہے؟  
 کیا شدتِ غم سے پیر ہن تار تار نہیں ہوا کرتے  
 ہاں — تو ہنشیں  
 یہ یادگار ہے پہلی اور آخری محبت کی  
 اس لئے تو اسے نہ بھین

---

# ”محروم“

سکھی! یتیم آئے  
اور..... میرے پہلو میں بیٹھ گئے  
لیکن میں بد نصیب — نیند سے نہ جاگی  
صد افسوس — میری نیند کتنی نعمت آئیز ہے۔

سکھی! یتیم آئے۔  
جب رات بالکل خاموش تھی  
ہاتھوں میں بربط لئے ہوئے  
اور اس کے مدھر گیتوں سے میرے سینے سُند رہے گئے

---

آہ یہ میری راتیں۔ ضائع ہو گئیں  
میں یتیم کی دید سے محروم رہتی ہوں  
جس کی سانس میری نیند کو چھوتی ہے۔

# سفر

میں نے خیال کیا تھا — کہ میرا سفر قریب الاختتام ہے  
میرے آگے راہ مسدود تھی۔

میرا زور راہ ختم ہو چکا تھا۔  
اور خاموشی سے پناہ لینے کا وقت آچکا تھا۔

لیکن — اے مالک

مجھے اسکا احساس ہے

تہاری مرضی ہر حال میں مقدم ہے

جب زبان پہلے الفاظ کو چھوڑ دیتی ہے

تو دل سے نئے نئے پھوٹتے ہیں۔

اور جہاں پرانی شاہراہیں مٹ جاتی ہیں

وہاں نئی بستیاں بس جاتی ہیں

لیکن اے مالک !

یہ سب تیری مرضی اور طاقت سے ہوتا ہے۔

(ٹینگور)

# ”سمندر“

سمندر  
کف آلودہ — شورش طلب

سمندر  
خاموش ہے — ایسے  
جس طرح ایک معصوم بچہ  
محو ہونو اب میں۔

مد و جزر پیدا ہوا  
لہریں اٹھیں دھیرے دھیرے  
ساحل آب آلودہ ہوا  
موجیں لا انتہا وسعتوں میں کھو گئیں

---

سمندر سو گیا

ایسے  
 جس طرح اک آشفتمزاج نوجوان  
 تھک کر آوارہ گردی سے  
 لوٹ آیا ہو گھر  
 اور ملے سکون اُسے  
 نیند میں

---

نیلے نیلے آسمان پر  
 شمع آفتاب روشن ہوئی  
 تھرکنے لگا اسکا عکس  
 پانی میں

یکایک  
 خوابیدہ سمندر بیدار ہوا  
 گہری نیند سے  
 چونک اٹھے جیسے کوئی  
 میٹھی میٹھی نیند سے  
 ایک دہشت ناک

## خواب دیکھ کر

سمندر میں  
 اک تلاطم بپا ہوا  
 آتش مزاج سمندر  
 کف آلودہ

لہروں میں مدوجزر پیدا ہوا  
 خاموش فتنے بیدار ہوئے  
 سمندر کے جاگنے پر

(ماغذفری مین)

---

# تمنا

میسکہ دلدار!  
 کاش میں تمہارے رنگذر کی خاک ہوتی  
 تاکہ جب تم گزرتے  
 تو میں بیتاب ہو کر  
 تمہارے قدموں سے لپٹ جاتی  
 اور اگر میرے نصیب یاوری کرتے  
 تو میں —  
 تیرے آستانے کی خاک کے ساتھ مل جاتی  
 تاکہ ہر روز  
 تمہارے کف پا کے بو سے لیتی

---

# کل

”یکل“ ہی تھا..... جب ہم  
 اس ”رومان پرور چاندنی“ میں کھوئے ہوئے وسیع میدان میں جدا ہوئے  
 ہم جان گئے — آنے والے لمحات کا مطلب۔  
 جب ہم نے ”چاندنی“ کی رونقوں کو لٹتے ہوئے دیکھا

---

یکل ہی کی بات ہے  
 جب ہم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے  
 ایک دوسرے سے جدا ہو گئے  
 جدائی کے لمحات نے ہمیں درد و کرب کی ”عظمت“ سے روشناس کیا۔  
 اور سبق سکھایا

”محبت قربانی ہے — محبت اک درد ہے۔“  
 اور ان میں ابدی و دائمی وابستگی ہے  
 اس لئے محبوب  
 ہماری محبت ناکام نہیں۔

# چاند کی کرن

رات تیرہ وقار تھی  
 متبسم ستارے بھاری بھاری بادلوں کے پردے میں پنہاں تھے۔  
 گہری تاریکی ہر چار سو ستولی تھی  
 اور وہ ”چاند“ جس کی مجھے جستجو تھی  
 تاریک ترین پردوں میں پنہاں تھا

---

آسمان کی نیلی بلند وسعتوں پر آویزاں پردہ کے گوشے سے  
 ایک لجاتی ہوئی کرن ہویدا ہوئی  
 ایک نانیہ کے لئے ناچی  
 چار سو پھیلی ہوئی تاریکیوں پر چلا کی  
 ایک لمحہ کے لئے جھلکائی۔ اور غائب ہو گئی

---

اس طرح نرم و نازک بول  
 شیرینی میں ڈوبے ہوئے  
 ان کے ————— جو پر خارا راستوں پر محنت و مشقت کا بوجھ اٹھائے  
 چل رہے ہیں ————— دکھی لمحوں کو ہلکا کر دیتے ہیں۔  
 اور ان کے تاریک زمانوں کو منور —————

---

# راکھ

وہ راکھ جو زمین پر بکھری ہوئی ہے۔  
میرے گزشتہ نشاط انگیز خوابوں کی ہے۔ جو چکنا چور ہو گئے۔  
اور اگر ان میں خوابیدہ چنگاری شعلہ جوالہ نہ بن گئی۔  
تو ان کی یاد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے فنا ہو جائے گی

میں نے ایک گڑھا کھودا اور اُس میں اپنی ہر ایک غم آگیں اور الم ریز  
امید کو دفن کر دیا۔  
میں نے اپنی تنقوٹوں کے سالیوں کو جلا کر خاکِ سیاہ کر دیا۔  
اس لئے — کہ وہ کہیں پھر میرے سینے میں تلاطمِ بپا نہ کر دیں۔

وہ راکھ جو زمین پر بکھری ہوئی ہے۔  
میری زندگی اور محبت کے خستہ ٹکڑے ہیں۔  
جو کہ میں نے تعمیر کیا۔

اس باقی ماندہ گوشت پوست کی طرف جو درس عبرت دے رہا ہے۔  
میں نگاہ کرتے جھجکتا ہوں۔

سامنے پھیلی ہوئی آرزوؤں کی راکھ جو ابھی تک سلگ رہی ہے۔  
میرے سینے میں بے پناہ آگ کے شعلوں کو بھڑکا رہی ہے۔  
لیکن زمانہ مجھے اپنی برباد محبت کو بھولنے میں مدد دیگا۔  
پیشتر اس کے زندگی کے سنس ٹوٹ جائیں۔

---

# تصریح محبت

اگر میں تیری محبت کا ایک دفعہ اظہار کر دوں  
 تو پھر سینے پر کوئی بوجھ نہ رہے۔  
 اور اپنی روحانی کشمکش سے آزاد ہو جاؤں  
 لیکن الفاظ۔ اس تصریح کے لئے — مبہم اور بے معنی سے ہیں۔  
 اس لئے میں ابتدا نہیں کرتا۔

---

ہر بار جب میں اُن رنگین خوابوں اور حسین خیالوں کو جو ایک محبوب کی  
 خدمت میں پیش کرنے چاہئیں  
 ایک منور گیت کی صورت میں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔  
 تو میری روح لرز جاتی ہے۔ میری آواز کانپ اُٹھتی ہے۔  
 اور پھر اس خوشگوار کام کو کل پر ڈال دیتا ہوں۔۔

---

تمہاری محبت ایک شیریں سادگی ہے

اس سے بڑھ کر کوئی بھی چیز پاکیزہ اور نازک نہیں  
 پھر اس کی تصریح کس لئے،  
 محبت وہ پاک جذبہ ہے - جو اظہار سے بے نیاز ہے -

---

# دُکھی جوانی

سوبا کا خط کمار کے ہاتھ میں تھا۔ اور وہ سوچ رہا تھا۔ سماج! آہ اسکے قوانین کس قدر سخت اور بہہ گیر ہیں۔ اُن سے چھٹکارا کب اور کیسے ہو سکتا ہے۔ اگر سوبا میسوا کی لڑکی ہے۔ تو پھر کیا وہ ہر طرح پاکیزہ و منترہ فہ ہے۔ اُسکی خطا صرف یہی ہے کہ میسوا کی لڑکی کہلاتی ہے۔ اُس کی ماں کی دوشیزگی اور عصمت و عفت یہی گراں بہا شے کو بھی کسی مرد ہی نے لوٹا۔ دوشیزگی کے پھول آبرو کے موتی کو اپنی بہیمانہ نفسانی خواہشات کی چٹان سے کچل کر چور چور کر دیا ہو گا۔ اُسوقت اس سنگدل سماج نے اس مرد کے لئے کیا سزا تجویز کی ہو گی۔ کچھ بھی نہیں!

پیارے کمار

میرے من مندر کے دیوتا۔ مذہب کے پُجاری۔ سماج کے نام لیوا۔ پریم بھکارن کو من مندر کے دیوتا کی پوجا نہیں کرنے دیتے۔ آہ! میں اسکے لئے مُوردِ الزام نہیں۔ میں مُردوش ہوں۔ میرے ادر آپ کے درمیان سماج کی ایک وسیع۔ بے پایاں خلیج حائل ہے، جسے پھانڈنا آسان تھا لیکن اب مشکل کر دیا گیا ہے۔ میں آپ کی ہوں لیکن کپ

میرے نہیں ہو سکیں گے۔ کیوں؟ — شاہی مندر کے ”پنڈت جی“  
آپ کو اس راز سے آگاہ کر دیں گے — نادم مرگ آپ کی

سو با

گما ایک دن شاہی مندر میں پوہ کے لئے گیا۔ مندر کی نقرئی گھنٹیوں سے  
مدھ بھری سیلانیں فضا میں مچل رہی تھیں۔ پجاری اپنے سروں کو تختیت سے دیوتا  
کے حضور میں جھکا کر بھجن گارہے تھے۔ اُن کے ہم آہنگ اور میٹھے میٹھے بھجنوں  
سے مندر کی محدود فضا سُرود سے معمور تھی۔

سو با جوانی کی ترنگوں میں ڈوب کر اپنی ہستی سے بے نیاز ہو کر دیوتا کے  
حضور میں بھجن گارہی تھی۔ اس کی حسین روح غم کی مسو کر ن سروں میں گھل مل  
کر کسی ایسے عالم میں جا چکی تھی جس کی اُسے خود بھی خبر نہ تھی۔ وہ خود مجسم دیوی تھی  
دیکھنے والوں کے سر خود بخود اس کے آگے جھک جاتے تھے۔ اُس نے کبھی زندگی  
کی سولہ بہاریں ہی دیکھی تھیں۔ اُسکے چمپئی رخساروں پر کاکل چپاں زہری لگیوں  
کی طرح لہرا رہے تھے۔ گلاب کی پتیوں ایسے نرم و نازک ہونٹوں پر گلابی راگ  
مقرش تھے۔ مدھ بھری آنکھوں سے امت رس کے دھارے بہہ رہے تھے۔ کمار  
نے اُسے دیکھا۔ اور من مندر کی دیوی بنا لیا۔ نگاہوں ہی نگاہوں میں دلوں کے  
لطیف راز ایک دوسرے پر آشکار ہو گئے۔ ان نگاہوں میں ایک راز نہیں تھا۔  
”راز محبت“ جو صرف دل کی زبان سے عیاں ہو سکتا ہے پوجا دھیرے دھیرے  
ختم ہو گئی۔ نعمات فضا میں ایک تھر تھری پیدا کر کے خاموش ہو گئے۔ اور دیوی

کے پجاری بھی ایک ایک کر کے مندر سے چلے گئے۔ سب سے آخر میں سوہا بھی شاخ بسنبل کی طرح چلکتی ہوئی آئی۔ کمار کی نگاہ شوق اس کے ہنریش قدم پر نثار ہو رہی تھی۔ وہ ہٹسکی۔ دزدیدہ نگاہوں سے کمار کی جانب دیکھا۔ اس کی میگوں آنکھوں میں شگوفوں کا تہم جھلک رہا تھا اور پھر خراماں خراماں چل دی۔ لیکن کمار بھی تک مندر کے صحن میں بت بنا کھڑا تھا۔

”کمار! کیسے کھڑے ہو۔“

کسی نے اُسے چونکا دیا۔

کمار نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ مندر کے پنڈت جی اُسے بلارہے تھے۔ اسے دیکھ کر کمار نے جلدی سے نسا کر کیا۔

”بیٹا! تم مغموم کیوں دکھائی دیتے ہو۔ کیا کوئی تکلیف ہو؟“

”نہیں پنڈت جی۔“

”اچھا بیٹا اگر تم مجھے۔“ پنڈت جی مجھو معلوم ہو۔“ شودیال نے بات کاٹتے

ہوئے کہا۔ ”بابو جی“ سوہا کو پیار بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ یہ نکر پنڈت جی کے چہرے پر رنج و غم کی ایک لہر چھا گئی۔ شو۔

”تم ذرا۔۔۔ وہ یہ سمجھ کر کہ پنڈت کمار کو عدم موجودگی میں سمجھانا چاہتے

ہیں۔ وہاں سے چل دیا۔ بیٹا ذرا میرے کمرہ تک چلو میں تم کو

کمرہ میں پہنچا دیوں گویا ہوئے۔“ کمار تم نے اس لڑکی کو کب دیکھا تھا؟“

”کیوں پنڈت جی کیا بات ہے۔“ کمار نے دریافت کیا

”پہلے میری بات کا جواب دو“

”میں نے اس سے پہلے اس لڑکی کو کبھی نہیں دیکھا۔ لیکن یہ تو بتائیے کہ اس میں کیا بڑائی ہے۔“

”نہیں میرا مطلب نہیں۔“

”تو پھر آپ کیوں —“

”بیٹا یہ ایک راز ہے۔“ آہ۔ وہ سماج کے قابل نہیں تم قسم کھاؤ۔ کہ اب اُسے دوبارہ دیکھنے کی کوشش تک نہ کرو گے۔  
کمار خاموش رہا۔

کمار کی زندگی میں یہ اولین دن تھا کہ اس کے دل نے اک کسک۔ اک خلش محسوس کی۔ وہ سوچنے لگا۔ پجاری کے سینہ میں کیا راز دفن ہے جسے وہ اپنے دل کی گہرائیوں میں چھپائے ہوئے ہے۔ قدرت نے سُوہا کو اپنے فیاض ہاتھ سے بنا کر اُسکے حُسن کو رشک کے قابل بنا دیا ہے۔ وہ زمین پر لطافت و رعنائی کی دیوی کا روپ دھارن کر کے پیدا ہوئی ہے لیکن پنڈت جی نے اُسے سماج سے خارج کر دیا ہے۔ میں اُسے اپنے من مندر کی دیوی بنا کر اُس کی پوجا کرنی چاہتا ہوں لیکن ”پنڈت جی اور سماج“ اسے ریت کچھ گھر وندے کی طرح ڈھار ڈھیں۔

دن — شام میں تبدیل ہو گیا اور شام تاریک رات میں بدل گئی۔

اُسے چین و قرار نہ تھا۔ دل کی بیکریاں دستوں میں ایک خیال تھا۔ سوہا کا۔  
 رات بیکراری میں بسر کی صبح ترشکے ہی اپنے من مندر کی دیوی کے  
 درشنوں کے لئے مندر میں پہنچ گیا۔ سوہا بھی بصدنا ز آئی۔ آج اُس نے ہلکے سبز  
 رنگ کی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ اور ایسے معلوم ہوتی تھی جیسے گلاب کی پتی اپنے  
 سبز رنگ کے غلاف سے نکلتی ہو۔ کمار نے اپنی نگاہوں سے پیامِ محبت دیا سوہا  
 نے بھی حسین ہلکیں اٹھائیں۔ اس کی ستارہ ایسی آنکھیں کمار سے دوچار ہوئیں کیونکہ  
 نے دونوں کے دل تیر محبت سے زخمی کر دیئے۔ کمار نے دھیمی سی آواز میں کہا۔  
 ”نستے“ — سوہا نے جواب دیا۔

”میں آپ سے — کمار نے عرصہ کرنے ہوئے کہا۔

”خاموش — لوگ ہماری طرف دیکھ رہے ہیں“

”نہیں — ہم اُن سے دُور ہیں“

”لیکن اگر کسی نے دیکھ لیا۔ تو —

”تو کیا ہوگا —

بدنامی — اس کے بعد دونوں دیوتا کے حضور میں سر بسجود ہو گئے۔ پڈت

جی نے پھر آج اکٹھے دیکھا۔ تو ٹھنڈی سانس بھری۔ وقت پہاڑی ندی ایسی

تیزی سے گزرتا جا رہا تھا۔ کمار اور سوہا دو قالب و یکجان ہو چکے تھے محبت کے

دیوتے ان کے دلوں کو پریم کی ڈور سے باندھ دیا تھا۔ اب وہ چوری چوری چاند

راتوں میں سیر کیا کرنے لگے۔ لیکن جب کبھی کمار نے سوہا کو شادی کے بارے میں کہا

وہ خاموش ہو گئی

ایک دن کمار کالج سے واپس آیا تو اُس نے دیکھا کہ اُسکے پتا کے کمرہ میں پنڈت جی بیٹھے تھے۔ اُسکو دیکھتے ہی کمار کا ماتھا ٹھنکا۔ کہ خدا ہی خیر کرے۔ معاملہ تو بے ڈھب سا نظر آتا ہے۔ کمار نے ابھی کتابیں بھی میز پر مشکل رکھی ہوں گی۔ کہ اُس کے پتا کی گرہ جی ہوئی اُوار سنائی دی۔

”کمار! دوسرے ہی لمحہ وہ مزاح کی طرح اپنے پتا کے سامنے کھڑا تھا۔

”متھیں شرم تو نہیں آتی۔“ کس بات کی؟ آپ کچھ بتائیں بھی۔

”پنڈت جی۔ ذرا اس طرف دیکھئے نا۔ کیسا اُٹھو لا اور بیخبر بن رہا ہے۔ جیسے

کچھ معلوم ہی نہیں۔ ننگ خانداں۔ بے شرم۔ چلو بھر پانی میں ڈوب مر ڈا اور جو کچھ کمار کے پتا کے منہ میں آیا کہہ ڈالا۔ جب اُن کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو پنڈت جی نے کہا۔ ابھی بچہ ہے۔ نا سمجھ ہے۔ میں اسے سمجھا دوں گا۔“

”خیر پنڈت جی کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ کمار کی شادی اُس لڑکی سے ہرگز

نہیں ہو سکتی۔ میرا فیصلہ اہل ہے۔

ایک دو تین دن — حتیٰ کہ ایک ہفتہ گزر گیا۔ لیکن سوہا کی اسے

کوئی خبر نہ تھی۔ اور نہ ہی اُس کا خط موصول ہوا تھا۔ سوہا کے بغیر اسکو ایک لمحہ قرار نصیب نہ تھا۔ اس کے دل میں وہ آگ لگ چکی تھی جس کا ٹھناباں نہ

تھا۔ محبت کے متعلق لوگ کہتے ہیں میٹھا ملٹھا درد ہوتا ہے ممکن ہے ٹھیک ہو لیکن اس کے دل و جگر میں ایک جلن سی ہو رہی تھی جیسے ان پر کسی نے دھکتے ہوئے انگارے رکھ دیئے ہوں۔ اتوار کا دن تھا۔ دس بجے کے قریب وہ سوہا کے گھر گیا۔ دروازہ مقفل تھا۔ وہ تذبذب کی حالت میں کھڑا تھا۔ ایک بڑھیا نے کہا ”کراڈیاد تو چلے گئے۔“

اُس دن دو بجے اُسے خط ملا کہ دیوتا پریم بھکارن کو من مندر کے دیوتا کی پوجا نہیں کرنے دیتے۔ اس کی زندگی کا رخ بدل گیا تھا۔ وہ بول اُٹھا۔ ”سوہا۔ میں تمہاری پوجا کرتا تھا۔ مجھے تم سے والہانہ محبت ہو گئی تھی لیکن سماج کے ٹھیکیداروں کو — وہ دل برداشتہ ہو کر اُٹھا۔ اور مندر میں جا کر سوہا کا خط دکھایا۔

پنڈت جی حقے کا کش لگاتے ہوئے بولے۔ ”لو سُنو۔ سوہا کی ماں ویشاہی ایک دن وہ اُس لڑکی کو میرے پاس لائی۔ اس وقت اُسکی عمر سات سال کے قریب تھی۔ اور کہا۔ کہ وہ شامت اعمال سے ویشیا بننے پر مجبور ہو گئی لیکن اس لڑکی کی عمر کو پاپ کی دنیا سے بچانا چاہتی ہو۔ دوران گفتگو میں وہ زار زار رو رہی تھی مجھے اس کی آہ و زاری پر سید رحم آیا۔ یہ بات بھی معقول تھی۔ اسلئے میں نے سوہا کی سرپرستی قبول کر لی۔ اور اس کی رہائش اور تعلیم و تربیت کا خاطر خواہ انتظام کر دیا۔ اُس کی ماں ہر ماہ سوہا کے اخراجات کے لئے ایک معقول رقم بھیجتی رہی۔ اب سوہا کو میں نے اس کی ماں کے پاس بھیج دیا ہے۔

”آپ نے یہ ظلم کیا :  
 ”نہیں نہیں کُمار۔ جو کچھ کیا گیا ہے۔ تمہاری بہتری کے لئے کیا گیا ہے۔“  
 ”میں اُسے ڈھونڈنے کی کوشش کروں گا۔“  
 ”تم اُسے کبھی نہ پاسکو گے۔ کیونکہ سوبا کی ماں ایک آباد گھرانے کو برباد نہیں  
 کرنا چاہتی۔“ پنڈت جی نے کہا۔

لیکن آہ سماج — کو کیا معلوم کہ کمار کے دل کی دُنیا تو برباد ہو چکی  
 تھی۔ زندگی اُسکے لئے اجیرن ہو گئی تھی۔ بچھی کے بغیر پنجرہ کس کام۔ اور بچھی اُٹھ چکا  
 تھا۔

سوبا ایک بیسوا کی لڑکی ہے۔ اور سماج کے قابل نہیں۔  
 آہ سماج۔

# اندھا بھکاری

مادھو — بھکاری تھا۔ اور بھکاری ہی نہیں بلکہ اندھا بھی۔

لیکن جنم سے نہیں۔ سبھی تو جنم سے اندھے نہیں ہوتے۔ اُس کی لیلانیاری ہے۔ جسے چاہا ویسا بنا دیا۔ دم مارنے کی مجال کہاں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں۔ کہ اندھا بن بد احتیاطی کا نتیجہ ہے۔ ٹھیک لیکن غریب کے ہاں احتیاط ہوتی ہی کہاں ہے؟ بھیک مانگنا مادھو کا خاندانی پیشہ نہیں تھا۔ یہ بھی اُس کے کرموں کا پھل تھا جو اُسے بھوکنا پڑا۔

جب تک بڑا بھائی زندہ رہا۔ اُسے بھیک مانگنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی لیکن جب وہ مر گیا۔ تو زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے اُسے ہر شخص کے آگے ہاتھ پھیلا پھیلا کر بھیک مانگنی پڑتی تھی۔ شاید بھگوان کی مرضی ایسی تھی۔

لیکن اُسے اتنا تو یاد تھا۔ کہ وہ اور سیلاوتی ریت کے گھر وندے بنا کر کھیل کرتے تھے۔ اُس وقت اس کی بیانی بالکل ٹھیک تھی کھیل کے دوران میں آپس میں جھگڑا ہو جانا تھا۔ تو بچاری سیلاوتی کو مادھو کی مار پیٹ بھی برداشت کرنا پڑتی

تھی۔ ایک دن اُسے بخار ہو گیا۔ لیلادوتی کئی بار بلانے کے لئے بھی آئی لیکن وہ کئی دنوں تک نہ جاسکا۔

مادھو چھپکاشکار ہو چکا تھا۔

جب وہ تندرست ہو کر چارپائی سے اُٹھا۔ تو بینائی جا چکی تھی۔

اب لیلادوتی اُسے بلانے کے لئے آتی تو وہ کہتا۔

”لیلادوتی۔ میں نہیں کھیلوں گا“

”کیوں؟“

”مجھے سمجھائی تو دیتا نہیں میں کھیلوں گا کیسے؟“

”میں تمہیں تمام باتیں بتاؤں گی۔“

اُسکے بعد لیلادوتی مادھو کا ہاتھ پکڑ کر لیجاتی۔ ”مادھو! یہ رامو کا گھر ہے۔“

”اچھا رامو کا گھر آگیا۔ مادھو کہتا۔“

جب نیم کا پیر آتا۔ تو لیلادوتی یہاں ٹھہر جاتی۔ پھر یہیں گڑیا کا بیاہ رچایا جاتا براتی بننے۔ باجے بکتے۔ قہقہے بلند ہوتے۔

معصوم بچوں کا بچپن کتنا شاندار تھا۔

لیکن اس مسرت و اہتاج میں مادھو کی روح دکھی تھی۔ اُسکا ہنجولی رمو

جب کھیل تماشا پھول پھلوڑی کی باتیں کرتا۔ تو اُسکا زخمی دل کراہ اُٹھتا۔ ایک

آہ نکلتی۔ اور بے بصر آنکھوں سے آنسو ٹپک کر خاک میں جذب ہو جاتے بچپن ایک

سہانے خواب کی طرح گزر گیا۔

مادھو نے شباب کی پرفیٹ وادیوں میں قدم رکھا۔ لیکن غریب کے لئے جوانی بھی وبال جان ہوتی ہے۔ جوانی میں۔ جوانی کی رنگینوں سے لطف اندوز نہ ہونا خود جوانی پر ظلم ہے۔

اس دنیا میں صرف اس قدر انقلاب آیا۔ کہ لیلادتی کا بیاہ ہو گیا۔ اور وہ اپنے سسرال سدھاری۔ جب ہمسائے اس کی حالت زار پر ترس کھا کر کہتے۔ آہ اندھا ہونا کس قدر بد قسمتی ہے تو مادھو کے دل پر ایک ضرب کاری لگتی۔ وہ تمام دن غموم سا رہتا۔

مادھو کا بڑا بھائی شام جب اس کو یوں پڑمردہ و افسردہ دیکھتا تو اسے تسلی دیتا۔

”ارے تو۔ فکر کیوں کرتا ہو۔ جب تک میں زندہ ہوں۔ تجھے فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔“

ایک سراب دار کا رفیع اشان محل تعمیر ہو رہا تھا۔ نیم عریاں۔ فاقہ کش۔ زرد رُو۔ انسان چوٹیوں کی طرح اس کی تعمیر میں تندھی سے مصروف تھے۔ جو بے بلند بام کے غلاموں میں سے ایک غلام شام بھی تھا۔ وہ پانچویں منزل پر آئیں لے جا رہا تھا۔ کہ پاؤں پھسلا۔ اور کئی فٹ کی بلندی سے نیچے آگرا۔ ہڈی پسی چکنا چور ہو گئی۔ دو تین سانس لیں اور پھر ہمیشہ کے لئے ٹھنڈا ہو گیا۔

شیام کی موت کوئی ان ہونی بات نہ تھی۔ سرمایہ داری کی بھینٹ پر۔ نوجوانوں کی جوانی۔ بچوں کا دلکش بچپن۔ عورتوں کا سہاگ۔ سبھی کچھ قربان ہو جاتا ہے۔ چلتے چلتے جیونیٹ پاؤں تنے آکر کچلی جاتی ہے اور پھر تڑپ تڑپ کر ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔ اس کی موت پر کون آنسو بہاتا ہے۔ غریب مزدور کی موت پر اسکے اپنوں کے سوا کون نوحہ خوانی کرتا ہے۔ اور سرمایہ داروں کو کیا ضرورت ہے کہ چنگ درباب، دھن دھن دھن کی پریف آوازوں میں غم آگئیں نالے شامل کر لیں۔

غریب شیام کی موت سے جہاں اس کی بیوی کا سہاگ لٹ گیا۔ بچے یتیم ہو گئے۔ وہاں مادھو پر بھی مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

اُس کی بے بصر آنکھوں میں آنسو صبح کے ستارے کی طرح لرز رہے تھے۔ جب تک بڑا بھائی زندہ رہا۔ اُسے کسی قسم کی تکلیف نہ ہونی لیکن اب —————  
بیستے اور بھاؤج کی پرورش کا بوجھ بھی اس کے کندھوں پر آن پڑا۔

سرٹک کے کنارے۔ ہر راہرو کے سامنے انتہائی عاجزانہ طور پر وہ بھیک کے لئے اپنا ہاتھ پھیلا دیتا۔ بعض راہگیر حسبِ توفیق پیسہ دیکر چلے جاتے۔ اور بعض سماں کو کوستے ہوئے گزر جاتے لیکن مادھو کو دن بھر میں اتنے پیسے نہیں ملتے تھے۔ کہ وہ کنبہ کا پیٹ پال سکے۔ ہر کاروبار کساد بازاری کی وجہ سے مدھم سا ہو گیا تھا۔ شام کو وہ لاٹھی ٹکیٹا ہوا۔ آہستہ آہستہ گھر کی جانب آتا۔ دن بھر کی کمائی بھاؤج کے سامنے رکھ دیتا۔ ایک دن مادھو کو سرٹک پر جاتے ہوئے ایک شخص سے

پنہ لگا کہ ریل میں اندھوں کو کافی بھیک مل جاتی ہے۔

اُس نے یہ بات غور سے سنی۔ اور پھر ایک دن وہ ٹرین میں بھیک مانگنے والوں میں شامل ہو گیا۔ وہ ایک گاڑی سے دوسری گاڑی میں جاتا۔ اپنی بے بصری کا واسطہ دیتا۔ مسافروں کو جان و مال کی سلامتی کی دعائیں دیتا۔ مسافروں کا دل مسافت میں رحم سے معمور ہوتا ہے۔ مادھو کو اتنے پیسے ہو جاتے تھے کہ کنبہ دو وقت پیٹ بھر کر روٹی کھا سکے۔

دسمبر کی ایک سرد شام تھی۔ سرد ہوا سائیں سائیں کر کے چل رہی تھی۔ اور ساتھ ہی ملکی ملکی ترشح ہو رہی تھی۔ بھیانک دُھند میں کبھی کبھی چمک اُٹھتی تھی۔ مادھو گاڑی میں مسافروں کو ”بابا نکھیں بڑی نعمت ہیں“ کہہ کر ان کے جذبات ترخم کو ابھار رہا تھا۔ آج اسے بہت کم پیسے ملے تھے۔ اور منزل مقصود تک پہنچنے میں صرف ایک اسٹیشن باقی رہ گیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کم از کم اس قدر تو پیسے مل جائیں جن سے کنبہ کا پیٹ بھر سکے۔ گاڑی کی رفتار کم ہونے لگی۔ اسٹیشن آ رہا تھا۔ وہ جلدی سے ایک ڈبے سے اتر کر دوسرے ڈبے میں جانے لگا۔ یہ اسکا ہر روز کا معمول تھا۔ کوئی نئی بات نہ تھی لیکن ہوا کے ایک تیز دند بھونکنے سے پٹری پر گرا دیا۔ گاڑی کے ہزار ہا سن بوجھ کے تلے آ گیا۔ پیہ سین چھائی پر پھر گیا۔ خون کی ندی بہہ گئی چند سیکنڈ میں بے جان جسم خون میں لت پت ہو گیا۔

گردش ایام کے ظلم کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ اور جیون کی زنجیر کی کرڑی

بھی ٹوٹ گئی تھی۔

جب قلی مادھو کی لاش اٹھا کر ہسپتال کی طرف لیجا رہے تھے تو ایک بابو کہہ رہا تھا۔

”سارے — مر کر بھی مصیبت میں مبتلا کر دیتے ہیں۔“ دور ایک تاریک گھر میں مادھو کی بھابھی اپنے اندھے دیور کی جان کی سلامتی کے لئے۔ دیوتاؤں سے پرارتھنا کر رہی تھی لیکن سبھی دعائیں تو قبول نہیں ہو جاتیں۔

# نرگس

بھیل کی دھیمی دھیمی لہریں کناروں کے قدم چوم چوم کر لوٹ جاتی تھیں  
نکھری ہوئی چاندنی میں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے جل پریاں رقصاں ہوں۔

دُور بند قامت درختوں کے لمبے لمبے ناچتے سائے ایسے نظر آتے تھے  
جیسے دیو لمبے لمبے ڈگ بھرتے جا رہے ہوں۔

نہ جانے میں کیوں کھویا جاتا ہوں؟  
ایسے دلفریب نظاروں میں۔ اک سُردر کیف آگئیں مجھ پہ طاری ہو جاتا ہو۔  
میں گیت گنگنائے لگا۔ شاید اسکا مطلب کچھ ایسا ہی تھا۔

”یہ نہ کہنا زہت

تمناؤں۔ امیدوں کے شیریں لمحات بیت گئے  
جب تک زندگی ہے۔ محبت تیری رہے گی۔

میرے دل میں۔

یہ نغمے الپے گاتیر خن و عشق کے  
میرا ساتھی بچم چونک اٹھا۔

”خورشید! کس کی محبت کے نغمے الاپے گا دل تمہارا“  
میں نے مسکراتے ہوئے کہا: ”زہت کے“  
”لیکن میں کبھی حُسن و شُش کے قصے نہیں دہراؤں گا۔“  
”کیوں؟“

”جب اپنی لہنوں نے جیون برباد کر دیا ہو۔“  
”کیا تمہیں کسی سے محبت ہے۔“ میں نے ذرا استعجاب سے کہا۔  
”ہاں۔“ مجھے محبت ہے۔ نہیں۔ بلکہ تھی۔  
”کس سے“ ————— ”زگس سے۔“

”کیوں۔ میں تو زگس کا نام آج ہی سُن رہا ہوں۔“ میں نے لفظ زگس پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے خورشید۔“ نجم نے جواب میں کہا۔  
کسی زمانے میں یہ نام میرے لئے ناہید کے نغموں سے زیادہ شیریں تھا۔  
یہ نام سُکر میں کیفِ زامستیوں میں کھوجاتا تھا۔  
”اور اب؟“ میں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا  
”اب۔ کوئی کشش۔ کوئی دلکشی نہیں۔“

بلکہ اک دردِ کسک۔ تڑپ۔ بےقراری ہے۔  
چاند کی کشتی آسمانی ندی کی سیلابی لہروں میں ہچکولے کھا رہی تھی۔ ننھے  
ننھے ستاروں کا عکس جھیل میں پڑ رہا تھا۔

جیسے کنول کے سفید پھول مُسکرا رہے ہوں۔  
 خاموشی نے ہلکے ہلکے سروں میں کائنات کو مسحور کر دیا تھا  
 دُور سے اک نغمہ لرزاں سنائی دے رہا تھا۔ جسے شاید پریم نگر کا کوئی  
 دکھی پریمی بڑے سوز سے گارہا تھا۔ تاکہ اس شعلہ بوالہ سے ارد گرد کے ماحول کو بھی  
 آتشیں بنا دے۔

بھئی — تجھ بن کون مئے گا مورے من کا گیت

من — کا گیت

میں نے نجم سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”یہ زگس کون تھی؟“  
 یہ المناک داستان ہے۔ خورشید تم اسے سننے کی تاب نہ لاسکو گے۔ شکستہ بر لب  
 کے تاروں میں اگر ارتعاش پیدا کیا گیا۔ تو اس میں سے وہ نغمہ نکلیگا۔ جو المناک ہوگا۔  
 لیکن میں نے اصرار کیا۔  
 وہ یوں گویا ہوا۔

”میں تمہیں یہ نہیں بتاؤں گا۔ وہ کون تھی۔ کس خاندان سے تھی۔  
 اپریل کی اک خوشگوار شام تھی۔ ہر چیز میں امن کی روح بسی ہوئی تھی۔  
 دُنیا دی رنج و غم جو ہر لمحہ ہم پر چھائے رہتے تھے۔ اسوقت نہ جانے کہاں چلے  
 گئے تھے۔ ہوا کی دھیمی دھیمی سرسراہٹ سے ہلکے ہلکے سُروئیں گیت کی آواز آرہی تھی۔  
 مجھے اک جذبہ کشاں کشاں اس جانب لے جا رہا تھا۔  
 اک حسینہ گارہی تھی جس کا حسین مکھڑا چودھویں کے چاند کی طرح تھا۔

اُس کا حُسن۔ اک فردوسی جمال تھا۔  
 وہ خود اپنے ہی گانے سے مسحور ہو رہی تھی۔ ماحول پر اک طلسم چھایا ہوا تھا۔  
 مجھے دیکھ کر وہ لجاجی گئی۔ لغتہ کی لہریں ہوا میں ناچ رہی تھیں۔  
 سُرخ رخساروں پر حیا کی سُرخ سی دوڑ گئی  
 لبوں پر مسکراہٹ رقصاں ہوئی۔ جیسے کلیوں کا انداز تبسم۔  
 سرشار نگاہوں سے شراب حُسن جھلکی۔  
 چار آنکھیں ملیں۔ اور جھک گئیں۔ دو دلوں میں دھڑکن پیدا ہوئی۔  
 اُن وہ لمحے

ہاں خورشید! یقین کرنا۔ اُس دن مجھ میں اتنی طاقتِ گفتار کہاں  
 سے آگئی۔

”دوبی! اک مدھر گیت اور سنا دو  
 راگنی کیا تھی میری بیتاب روح کے لئے پیغامِ حیات تھی۔ میں نے اپنی  
 روح اپنی جوانی۔ اپنے گیت زگس کی نذر کر دیئے۔  
 اسی جگہ ہم تاروں کی چھاؤں میں گیتوں کے جھوٹے میں پریم کے منہ پر سپنہ  
 دیکھتے تھے چٹکی ہوئی چاندنی میں چاند کو گواہ بنا کر ہم نے قسم کھائی تھی کبھی جدا  
 نہ ہوں گے میرے دل پر ان راتوں کی کیف زکیفتیں نقش ہیں۔

ایک۔ دو۔ تین دن گزر گئے۔ ”زگس“ نہ آئی۔ مجھ پر ایک وحشت سی طاری ہو گئی

بالآخر چوتھے روز - شام کو میری اُس سے ملاقات ہوئی

یہ میری آخری ملاقات تھی۔ ہاں آخری۔

نرگس کو شادی کے بندھنوں میں جکڑا جا رہا تھا۔ اُس کے گلاب کے شاداب پھول ایسے چہرے پر زردی پھار رہی تھی۔ وہ پھول جو قبل از وقت مرجھا گیا ہو۔ نرگس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے چمک رہے تھے۔ جدانی کا پیام اک شعلہ تھا۔ اُس نے میرے خرمین سکون کو جلا دیا۔

”تم جا رہی ہو۔ مجھے اکیلا چھوڑ کر۔“

”آہ اُس شرابی کا کیا بنے گا۔ جو تمہاری سمرست آنکھوں کے میخانے سے خم کے خم پیتا رہا ہو۔ اب اک تلچھٹ کے لئے ترسیگا۔“

اُس کا جواب

اک آہ سرد تھی۔ دلدوز۔ جگر شکاف

آہ — یہ ساج۔ اور اس کے بندھن

نرگس کا حسین چہرہ۔ ایک پل بھر کے لئے میری آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوتا۔

ایسے جس طرح کوئی دھندلا خواب ہو۔

اتنا کہ ہر خم بڑبڑانے لگا۔

تمہارے عہد و پیمان پریم کے بندھن۔ کالج کی چوڑیوں سے بھی زیادہ

نازک بکھلے۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میری متناؤں کے پھول کھلنے سے پیشتر مرجھا جائیں گے تو میں کبھی بھی —

تمام فضا پر اداسی۔ پڑ مرو گی چھا گئی۔

چاند نے بھی اپنے چہرے کو دوائے ابر میں چھپا لیا۔

میں نے نجم سے کہا۔ ”آؤ گھر چلیں۔ مجھے وحشت سی ہو رہی ہے۔“

جب ہم گھر کی جانب لوٹ رہے تھے۔ تو ریڈیو پر کوئی گارہا تھا۔

سوجا۔ دکھی۔ جوانی سوجا۔

بھل بھل کر تے تارے ۞ دور نظر سے پریم پیارے

ہنسے کیوں قسمت کے مائے ۞ روتے روتے بے مدد ہو جا

سوجا ————— دکھی جوانی۔ سوجا

نجم کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرے اور خاک میں جذب ہو گئے۔

—————

## نیل لاف

نیلے نیلے۔ پیلے پیلے۔ اودے، سُرخ و سفید بھی رنگ کے کاغذ کے پُرے  
 ہو امیں ناچ رہے تھے۔ خورشید اُنھیں ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا تھا۔ اور ساتھ ہی  
 ساتھ کاغذوں کو پھاڑتا جا رہا تھا۔ یکایک اس کے ہاتھ میں ایک نیلے رنگ کا  
 لاف آتا۔ اور شاید چھوٹے سے بکس میں یہ آخری ہی کاغذ تھا۔ خورشید لاف کو دیکھ  
 کر خیالات کی دنیا میں گم سا ہو گیا۔ ایسے جس طرح ننھا بچہ نمید کی لکش وادی میں  
 کھو جاتا ہے۔ اور پھر خود ہی چونک اُٹھا۔ ”زگس کا خط“

مانو — ایسے جس طرح کوئی شخص ڈراؤنا خواب دیکھ کر بیدار ہو جائے۔  
 لاف میں چند حروف لکھے ہوئے تھے۔ خورشید نے اسے بغور پڑھا۔  
 ”آج شام کو چائے میرے ہاں بھیجیگا۔ اُمید ہے کہ آپ میری التجا  
 کو نہیں ٹھکرائیں گے۔“  
 ”زگس“

خط پڑھتے ہی اُسے آج سے چار سال پہلے کے تمام واقعات یاد آ گئے۔ اور  
 ہر واقعہ بڑی سرعت سے سینما کی متحرک تصاویر کی طرح ایک ایک کر کے نظر آنے  
 لگا۔ آج سے چار سال قبل وہ ایم اے میں پڑھتا تھا۔ ان دنوں زگس بی، اسے کی

طالبہ تھی۔ پھر اسے کالج کا وہ مباحثہ یاد آیا۔ جس کا موضوع تھا: کیا طلبہ سیاست میں حصہ لے سکتے ہیں۔ اس میں اس کے علاوہ سوتی چند رکانتا سوا۔ منموہن۔ راجکمار۔ اور رشید بھی تو مقررین کی صف میں تھے۔

لیکن جب وہ تقریر کے لئے کھڑا ہوا تھا۔ تو ہال تالیوں سے گونج اٹھا تھا۔ اس کی تقریر کیا تھی۔ ایک طوفانِ عظیم تھا۔ جو ہر چیز کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جانا چاہتا تھا۔ الفاظ نہیں شرارے تھے۔

اُس کے سینہ میں اک آگ لگی تھی اور وہ اس آگ کو سامعین کے دلوں میں منتقل کر رہا تھا۔ یونیورسٹی کے طلبہ اور طالبات کے علاوہ شہر کے محرزین بھی تقریر سن رہے تھے۔ اُس کی آواز کا زیر و بم حرکات و سکنات کی لادیر و پذیر تھی۔

طالبات کے زمرہ میں نرگس سب سے پہلی قطار میں بیٹھی۔ نہایت غور سے خورشید کی تقریر سن رہی تھی۔ اور دل ہی دل میں اس کی لیامت کی داد دے رہی تھی۔ کبھی کبھی دُزدیدہ نگاہوں سے اس کے چہرے کی طرف دیکھ لیتی تھی اور وہ بھی تقریر کے دوران میں ایک اچھٹی ہوئی نظر ڈال لیتا تھا۔ اُس کے خیالات کا سلسلہ یہاں آکر ٹوٹ گیا۔

پھر اُسے وہ لمحہ یاد آیا۔ جب لائبریری میں کسی نے اس کے شانے پر اہستہ سے ہاتھ رکھ دیا۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا۔ نرگس۔ وہ لجاسی گئی۔ اس نے شرماتے ہوئے خورشید سے کہا تھا

”میں انگریزی میں کمزور ہوں۔ کیا آپ میری کچھ مدد کریں گے؟“  
 ”میں ٹیوشن نہیں کہا کرتا“ یہ اسکا جواب تھا۔  
 اسے سنکر وہ کتنی افسردہ ہو گئی تھی۔  
 ”اُس نے کہا تھا لیکن پڑھائی میں کوئی مشکل آئے تو میں حاضر ہوں۔“  
 ”شکریہ“

اُن کی واقفیت کی ابتدا یوں ہوئی تھی۔ اُس کے دوسرے دن اُسے نرگس کا خط ملا تھا۔ اور یہ اسکا سب سے پہلا خط تھا مختصر سا۔ لیکن پُر از معانی۔  
 ”آج شام کی چائے میرے ہاں پیجئے گا۔ اُمید ہے کہ آپ میری  
 التجا نہیں ٹھکرائیں گے۔“  
 ”نرگس“

خورشید نے دوبارہ اس خط کو پڑھا۔ اور پھر گہری سوچ میں مستغرق ہو گیا

نرگس خورشید کی آرزوؤں کا مرکز تھی۔ اسکا ایمان تھی کہ محبت ہی تو کائنات کا سب سے قیمتی خزانہ ہے جب خورشید نے ایم، اے (فلسفہ) پاس کر لیا۔ تو کالج میں فیسر ہو گیا۔ نرگس بھی بی، اے کر چکی تھی۔ چنانچہ وہ ایک دن دونوں ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کے ہو گئے اور ان کے درمیان ایک نہ ٹوٹنے والا ریشم کی گانٹھ سے سچپید اور شیشے سے زیادہ نازک رشتہ قائم ہو گیا۔  
 شادی کے دو تین سال تو نو خیز عشق کی غشی میں گزرے اور وہ ان لمحات کو افسردگی سے یاد کرنے لگا۔ جب خورشید کی زبان پر نرگس اور نرگس کے لئے

خورشید ب کچھ تھا۔ اُسے اپنے دوستوں سے ملنا جلنا ترک کر دیا تھا۔ اور چاہتا تھا کہ ہر وقت نرگس ہی کے رُخ نگارین سے تشنہ کام آنکھیں سیراب کرتا رہے اسکی آنکھیں ہنوز تشنہ کام تھیں لیکن گذشتہ چند مہینوں سے قدرے شکر رنجی ہوئی شروع ہو گئی تھی۔ اور کبھی کبھی گھر بوجھ گڑے گھر کی راحت اثر فضا کو مسموم کر دیتے تھے۔ اب خورشید کو بھی حیلے بہانے کی عادت ہو گئی تھی۔ اگر وہ سینا جاتا تو کہتا۔ کلچ میں لیکچر تھا۔ دوستوں کے ساتھ گھنٹوں سوپ (SWEEP) کھیلی جاتی۔ تو یہ بہانہ مقبول تھا کہ پروفیسروں کی میٹنگ تھی جس میں اس کی شمولیت ضروری تھی لیکن نہ جانے اس دن معمولی سے معاملہ نے کیوں اتنا طول پکڑا اور بات بڑھتے بڑھتے بڑھ گئی۔

اور بات بھی تو معمولی تھی۔ نرگس نے شام کے کھانے سے لیکر ابجے تک خورشید کی انتظار کی۔ اور بغیر کچھ کھائے پئے جا کر لیٹ رہی۔ نیند تو کوسوں دُور تھی۔ ماما نے بہتیرا کہا۔ کہ بی بی آپ تو کھانا کھالیں۔ لیکن وہ نہ مانی۔ اس کے بعد ماما اپنے گھر چل دی۔ نوکر کو بھی آج ہی شاید چھٹی کی ضرورت تھی۔

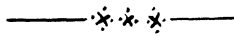
خورشید جب سینا سے واپس لوٹا۔ تو کھانا مانگا۔

”یہ تو ٹھنڈا ہے۔ اسے گرم کر دو۔“

”آج ٹھنڈا ہی کھا لیجئے گا۔“

اتنا سُکر وہ اُگ بجولہ ہو گیا۔ اور جو مُنہ پر آیا۔ کہہ دیا۔ نرگس یہ ناروا سلوک

برداشت نہ کر سکی۔ وقارِ سنوانی کو ٹھیس لگی۔ اُس نے سوچا کہ وہ صبح میسے چلی جائیگی وہ اس گھر میں ایک لمحہ کے لئے بھی ٹھہرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ اور صبح وہ میسے جا چکی تھی۔



نرگس ایک گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ وہ اپنی محبت کے ایام کو یاد کر رہی تھی جبکہ خورشید اس کا والدہ وشیفہ تھا اس کے بغیر اس کی زندگی ادھوری تھی آج اُسے میسے آئے ہوئے ایک ماہ سے زیادہ عرصہ ہو چکا تھا لیکن خورشید نے خود اگر اُس کی خبر لینا تو کجا اُسے خط تک لکھنے کی تحفیف گوارا نہ کی تھی۔

گذشتہ چار برس میں اور آج کے دن میں کتنا تفاوت تھا۔ وہ اٹھی اور مضطرب ہو کر کمرے میں ٹپلنے لگی پھر آئینہ میں اپنا عکس دیکھ کر ٹھٹکی۔ لمبا قد۔ بھرا ہوا سینہ۔ بلی آنکھیں۔ سر پر بکھرے ہوئے سیاہ بال جو صبح سے منت پذیر شانہ نہ ہوئے تھے بیاہ گھنی بسی بلکیں۔ وہ اپنا عکس دیکھ کر خود فریفتہ ہو گئی۔ اور خود ہی بڑبڑا اٹھی۔

”کیا خورشید تاج“ کی زلف کا اس پر نہیں ہو گیا۔ پچھلے۔ دنوں سے نہیں نہیں۔ مجھو خورشید پر ایسا لگان نہیں ہو سکتا۔

میرے بغیر ان کو تکلیف ہوتی ہوگی۔ وہ ہیں بھی لا پرواہ۔ کمرے گرد و غبار سے اُسے پڑے ہوں گے۔ فرنیچر پر گرد کی تہیں جمی ہوں گی۔

”ماں! آج میں اپنے گھر جاؤں گی“

”ابھی تمکو آئے کون سے دن ہوئے ہیں۔ کچھ دن اور تو رہو۔“  
 ”نہیں میں کیسے زیادہ دن رہ سکتی ہوں۔ میرا رادہ آج شام سے قبل  
 جانے کا ہے۔“

نبیلا الفاظ ابھی تک خورشید کے ہاتھ میں تھا۔ وہ سوچ رہا تھا ہیں نے نرگس  
 پر بہت ہی ظلم کیا ہیں دوستوں کے ساتھ سینا نہیں گھومتا رہا ہیں رات کے بارہ بارہ بچو  
 تک تاش کھیت رہا۔ اور اس سے حیلہ سازیاں کرتا رہا ہیں آج شام نرگس کو منا کر لے  
 آؤں گا۔

خورشید انہی خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ کسی نے پیچھے سے دبے پاؤں آکر اس کے  
 شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ خورشید نے پٹ کر دیکھا ”نرگس“  
 نرگس کی نرگس آنکھوں میں آنسو جھلک رہے تھے۔ خورشید نرگس کے  
 مرمری دنازک ہاتھوں کو اپنے ہونٹوں تک لے گیا۔ اور محبوب ہو کر دھیمی سی آوازیں  
 کہنے لگا۔

”نرگس مجھے معاف کر دو“

”پہلے آپ مجھے معاف کر دیں“

خورشید کی باہیں نرگس کی صراحی دار گردن میں جمائل ہو چکی تھیں لیکن ہوا  
 میں ابھی تک کاغذوں کے اُودے۔ نیلے۔ پیلے۔ سُرخ و سفید کاغذوں کے پُرنے  
 نلج رہے تھے۔

# زندگی کی دو تصویریں

یہ ایک حقیقت ہے۔ یہ وہ واقعہ ہے، جسے میں نے بچپن میں خود دیکھا اور پہروں نمائے جودہ  
 سماج کے نظام کے تعلق میں سوچا رہا۔ آہ مغس ہندوستان تیرے سپوتوں کے لئے تیری ویس زمین  
 دن بدن تنگ ہوتی جا رہی ہے۔

(ع روڈ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو)

## پہلی تصویر

”ڈاکٹر صاحب، ڈاکٹر صاحب

”فرمائیے۔“ (ذرا دھیمی آواز سے)

”ڈاکٹر صاحب دیکھئے نا۔ میرے کتے کو بخار ہو گیا ہے کل رات سے

اُسے باہل کچھ کھایا یا نہیں۔“ اتنا کہہ کر ہندوستانی مس نے نوکر کو آواز دی۔ جو

باہر کار کے پاس کھڑا تھا۔ اُس نے کتے کو گود میں اُٹھالیا اور ڈاکٹر صاحب کے  
 ساتھ معائنہ کے کمرہ کی طرف لے گیا۔

یقین کیجئے گا۔ پیارے کتے کی جدائی میں مس صاحبہ بیل و مضطرب ہوئیں

لیکن ڈاکٹر صاحب کے یقین دلانے پر کہ ابھی واپس لوٹتا ہوں۔ وہ کمرے میں ٹھہرنے کے قابل ہوئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹر صاحب لوٹے اور کہا۔  
”اسے چیچک کا عارضہ ہے۔“

”چیچک“ مس صاحبہ پر سبلی ہی نوگر پڑی۔ بڑی رقت بھری آوازیں اور  
”مطمینانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا یہ بچ جائے گا۔“  
”کیوں نہیں۔“ ڈاکٹر صاحب نے جواب میں کہا۔  
”لیکن اس کو انجکشن کرنا پڑیگا۔“

”کوئی حرج کی بات تو نہیں۔“ مس صاحبہ نے دریافت کیا۔  
”نہیں۔ تو اس کے لئے آپ کو دس روپے ادا کرنے پڑیں گے۔“  
”ڈاکٹر صاحب آپ روپوں کی فکر نہ کیجئے۔ خواہ پچاس خرچ ہو جائیں۔“  
لیکن اس کی جان بچ جائے۔ یہ کہہ کر مس صاحبہ نے منی بگ میں سے دس روپے  
کا نوٹ نکال کر ڈاکٹر کو دیدیا۔

## دوسری تصویر

وٹر نری ہسپتال سے تھوڑی دُور ٹریننگ کالج کے چوک کے قریب ایک  
بھکدن پر میری نظر پڑی مجلسی، بھوک اور پیاس کی تصویر۔ اُس نے دریدہ اور کہنہ  
لباس پہنا تھا۔ جو اُس کی ستر پوشی کے بھی ناقابل تھا۔ ہونٹوں پر بھوک کی وجہ سے  
پہڑیاں جھبی ہوئی تھیں۔ اس کی گود میں ایک دُبل پتلا سا بچہ تھا۔ جو اس کی چھاتی سے

دودھ حاصل کر نیکی ناکام سعی کر رہا تھا۔ اور دودھ نہ ملنے پر بلبلا اٹھتا تھا۔  
 بھکارن ہر راگیر کے آگے دست سوال دراز کرتی۔ "بابو ایک پیسہ مل جائے  
 کل سے بھوکے ہوں۔"

لیکن شخص اس کی حقیر سی آواز کو پائے استخار سے ٹھکراتا ہوا جا رہا تھا۔  
 میری نظر کے سامنے زندگی کی دو تصویریں۔

غربت۔ بھوک۔ افلاس۔ عیش و عشرت۔ بھوکی  
 یہ روح فرسا منظر دیکھ کر میں بڑا افسردہ خاطر ہوا۔ اور مٹا مجھے حضرت  
 اقبالؒ کا حکیمانہ قول یاد آیا۔

"اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگادو۔"

# اوشا

اُسکا نام اوشا تھا۔

وہ خوبصورت تھی۔ صبح بہاراں سے زیادہ۔ شاعر کے نازک خیالوں سے زیادہ  
دلکش۔ اس کی چال لہک کو بھی شرماتی تھی۔ آواز ناہید کے ربط سے زیادہ دلفریب  
اور سُریلی تھی۔ دل کی گہرائیوں میں اُترنے والی چنیل اور ست آنکھوں میں محبت  
انگڑائیاں لیتی تھی

دھانی رنگ کی رٹھی میں وہ ایسے معلوم ہوتی تھی جیسے بہار کی دیوی خود  
آسمان سے اُتر آئی ہو۔ میری اور اس کی ملاقات مالا بارہل۔ ہیں ہوئی۔  
رات بھیگ رہی تھی۔ ہولکے پاکیزہ اور لطیف جھونکے کیف آگئیں تھے۔  
صاف اور شفاف آسمان کی نیلگوں سطح پر ستارے چٹکے ہوئے تھے۔ ابدی ستریں  
شراب بنگر ہرں رہی تھیں

میں نے اُسے دیکھا۔ اور دیکھتے ہی کہا: ”یہ وہی ہے۔ وہی۔“  
”سپنوں کی رانی“ جسے میرا تصور اکثر چاندنی راتوں کی غمگین خلوتوں میں  
دیکھنے کا عادی ہے۔ وہ ایک پنچ پتی تھی۔

میں سامنے کی بیچ پر آکر بیٹھ گیا۔ ”آپ برا تو نہیں منائیں گی۔“ میں نے کہا۔  
 ”نہیں۔“ یہ آواز مندر کی نفرتی گھنٹی کی طرح دلاؤ بیگنی۔  
 یہ ابتدا تھی ہماری محبت کی۔

میری نظریں اس کی نظروں سے دوچار ہوئیں۔ آہ وہ لمحے۔  
 اُس نے پھر اُن نگاہ غلط انداز ڈالی۔ میں جھینپ سا گیا۔  
 یہ محبت کا آغاز تھا۔

آہ! اسکا انجام کتنا جانکا ہوتا ہے۔ میں اس سے بے خبر تھا۔

ایک شام  
 اپیل کی ایک ناقابل فراموش شام کو اولین بار ہم دونوں اکٹھے سیر کے  
 لئے گئے۔ میں کس قدر مسرور تھا۔ اس کا اندازہ کون لگاے۔

جس طرح مضراب ساز کے تاروں پر نہیں ٹھہرتا۔ اسی طرح میرے قدم  
 زمین پر دفور سرت سے نہیں پڑتے تھے۔

بازار کے کونہ پر ایک لڑکی پھول بیچ رہی تھی۔

جب میں پھول لیکر آیا۔ وہ بول گویا ہوئی۔ ”کیا آپ کو پھولوں سے محبت؟“

”کون انھیں پیا نہیں کرتا۔“ میں نے جواب دیا۔

”لیکن — مجھے پھولوں سے محبت نہیں۔“

”کیوں؟“

”پھولوں سے نہیں بلکہ ان کے مڑ جھلنے سے۔ یہ بڑے بے مہر ہوتے ہیں

مردوں کی طرح۔ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔

اور میں سوچنے لگا۔ یہ ہے تو ٹھیک۔ واقعی پھول مڑ جھا بہت جلد جاتے ہیں

لیکن مرد — اسپر میں نے سوچنا لا حاصل سمجھا۔

بجلی کی روشنی سمندر میں عکس ریز تھی گیسٹ وے انڈیا۔ کا طویل ترسایہ نظر

آتا تھا۔ اس کی دائیں جانب "تاج محل" کی سر بفلک "بقعہ نور" عمارت ایسے کھڑی

تھی جیسے شہر کا جائزہ لے رہی ہو۔

سمندر کی لہریں اٹھتیں۔ سنگین دیواروں سے سر پٹک کر بھر بکراں کی لانا

دستوں میں اپنے آپ کو کھودتی تھیں۔

دُور راج ہنس کی طرح ایک کشتی اپنے سپید بادبان پھیلائے سطح آب پتیر رہی

تھی اور اس سے پرے اندھیرے میں ایک بڑا لوزی جہاز پر چند سائے متحرک نظر آ رہے

تھے۔ روشنی کے مینار کی روشنی بجلی کی چٹک معلوم ہوتی تھی اور ہم دونوں پہلو پہلو

بیٹھے ان کا نظارہ دیکھ رہے تھے۔

یہ ایک میں نے اوشا سے پوچھا "کیا تم نے کسی سے محبت کی ہے؟"

"نہیں۔ کر رہی ہوں۔"

میں خاموش ہو گیا۔ لیکن اس خاموشی میں مسرت کی روح بسی ہوئی تھی۔

میری دنیا سے محبت! ایک دھن کے تصورات سے بھی زیادہ حین تھی۔ میں چاہتا

تھا۔ "وہ اور میں۔" میں اور وہ۔ "دونوں اسی طرح بیٹھے رہیں۔ یا یہ لمحے اس قدر

طویل ہو جائیں کہ کبھی ختم ہی نہ ہوں۔

”اوہ پھول۔ یہ تو مجھے یاد ہی نہیں رہے۔“ یہ کہہ کر میں نے ایک پھول اوشا کے بالوں میں لگا دیا۔

”رات چھا رہی ہے۔ اوشا نے کہا۔ اب واپس چلنا چاہئے۔ دیر ہو رہی“  
راستے میں ہم نے ایک دوسرے سے بات چیت نہ کی۔  
نہ جانے کیوں؟ میں تو یہی سوچتا رہا۔

”میں محبت کی بازی پر جوانی کا داؤ لگا رہا ہوں۔ ہار ہوگی یا جیت۔۔۔“  
لیکن محبت میں جیت بھی ہار۔ اور ہار۔ جیون کی بربادی۔“

اور وہ نہ جانے کیوں خاموش تھی۔ اسوقت چونک اٹھی جب کنڈکٹر نے  
کہا۔ ”لال باغ۔“

پھر اک دلیواز مسکراہٹ سے الوداع کہہ کر گھر کی جانب تیز تیز قائم اٹھاتی  
ہوئی چل دی۔

جب دل میں کسی کا خیال بس جائے۔ تو انسان دیپک کی طرح جلتا رہتا  
ہے۔ پریمی کو اپنے پریم کی سُندر صورت کے سوا اور کوئی چیز اچھی ہی نہیں لگتی۔  
میں ”اوشا“ کے خیال میں اک نغمہ دھیرے دھیرے گنٹنارہا تھا۔ اس کا  
مطلب شاید یہی تھا۔

سکھی! میں نے بیتم کو ڈھونڈ لیا۔  
جب وہ اپنی ہنسی بجاتا ہے۔

تو سنا بھری دھرتی پر پریم چھا جاتا ہے۔  
 پریم کے رنگ میں پریم کا رنگ ملا کر  
 آج ہم دونوں نقص کریں گے۔ اس دنیا کے ختم نہ ہونے تک  
 میرے من کے دیک میں امرت دمک رہا ہے  
 اور میں پروانہ کی طرح جل جل کر ختم ہو جانا چاہتی ہوں۔  
 کسی نے دبے پاؤں آکر میری آنکھیں بند کر دیں۔  
 اور بولیں "آواز میں کہا۔"

"نام بتا دیں — تو آنکھیں کھولیں گے۔"  
 "میرے پینے کی رانی" ادشا

زمانہ نام ہی ہے اک گردش کا۔ وقت کا پہیہ ہر وقت تیزی سے گھومتا رہتا  
 ہے۔ آئے دن نئے نئے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں۔ خلاف امید جن کا دم  
 و گمان بھی نہیں ہوتا۔

وقت نے پانسہ پلٹا۔ اور مجھے اس "دیبا شعر و حسن" سے چند ماہ کے لئے آنا پڑا  
 اسی اثنا میں خط و کتابت کا سلسلہ قائم رہا۔  
 لیکن ابھی دو ماہ بھی نہ گزرے ہوں گے کہ ادشا نے خطوط کا جواب دینا  
 بند کر دیا۔

مجھے اس تلخ حقیقت کا احساس ہو چکا تھا کہ "عورت کی محبت سمندر کی

طوفانی لہروں کی طرح ہے۔ جو سفینہ حیات کو پاش پاش کر دیتی ہے۔ اگر اوشا نے مجھ سے محبت نبھانی نہیں تھی۔ تو ————— تو کسی کو اپنا بنا کر چھوڑ دینا کیا میری عظیم نہیں

ایک شام کا ذکر ہے۔ میں ”چوپائی“ پر گھوم رہا تھا حسینوں کے جھگڑوں میں پیارے پیارے بچوں کے ہتھکے بھی بلند ہو رہے تھے کہ معا میرے کان میں اک آشنا آواز آئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ ”وہ“ تھی۔ اور اسکے ساتھ ایک ادھیر عمر کا شخص کھڑا تھا مجھے فوراً احساس ہوا کہ یہ اسکا خاوند ہے۔ اُس نے میری طرف دیکھا۔

نہ جانے کیوں۔ اُس نے مسکراتے کی کوشش کی۔ تاکہ غم کو دُور کر دے۔ ہونٹوں پر ہنسی۔ آنکھ میں آنسو۔ ایسے جس طرح صبح کے وقت کوئل پھول کے بولوں پر ہنسی۔ آنکھوں میں آنسو۔ محبت اک لڑکی کی روح کو ایک پھول کی طرح شگفتہ بھی کر سکتی ہے اور بادِ سُم کے تند جھونکے کی طرح مڑبھا بھی دیتی ہے۔

دُور آسمان پر اک ننھا سا تارہ جھللا رہا ہے۔ اور اس کی جھللاتی روشنی میں اک پیکرِ نظر آ رہا ہے۔ میں اُسے یاد کرتا ہوں۔ وہ مجھے بھول چکا ہو۔

مجھے معلوم ہوتا ہے۔ جیسے یہ زمین۔ یہ آسمان۔ یہ ماحول اک ساز ہے جس سے  
اک رگ نکلتا ہے۔ یاس آمیز غم آگیاں۔ تقدیر نے پانسہ پھینکا۔ مجھے ادا آئی۔ لیکن  
اس مسلسل غم جا کاہ کا کتب ختم ہو گا۔

زندگی کے سانس ہیں۔ ایسے جیسے بادِ خزاں کا طویل اور غم انگیز رگ !  
آہ ”محبت کے فریب“

---

# عورت کی فطرت

عورت کو سراپا نغمہ اور رنگین پھول سے تشبیہ دی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ عورت ایک

ڈسنے والی ناگن ہے۔ اور سراپا نغمہ جس کے سچنے سے انسانی عقل قاصر ہے

شمیر آنے بیلوں کے لئے چارہ کاٹتے ہوئے اپنے بوڑھے باپ شعبان سے کہا۔

”بابا! کل شام نشاہ رت بانی کے کھیت کی طرف سے آ رہی تھی میں نے اُسے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ یہ بے عزتی دیکھی نہیں جاتی۔ شریک جی بھر کے طعنے دیتے ہیں۔ سویرے الاؤ پر فوراً یہی باتیں کر رہا تھا۔ میرے آنے پر تمام خاموش ہو گئے لیکن میرے کان میں یہ بھنگ پڑ گئی۔“

”بے عزتی کی زندگی سے تو موت لچھی۔ پیر جی نے بھی کہا تھا۔ کہ بے عزت آدمی میں ایمان نہیں ہوتا۔“

”ہوں“ کہہ کر بوڑھے شعبان نے سر د آہ بھری۔ اور پھر آسمان کی طرف دیکھ کر لگا بشارت دہ۔۔۔ آنے والے مولناک لمحہ کا تصور کر رہا تھا۔

”بابا! میری تو یہ صلاح ہے کہ قصہ ہی پاک کر دیا جائے نہ رہے بانس نہ بجے

بنسری۔

نشاہ ۱

شعبان کی لڑکی تھی۔ اور سات بھائیوں کی ایک بہن۔  
 دیہاتی خُسن کا مرقع۔ کانوں میں چاندی کے بندے۔  
 جب وہ سُرخ رنگ کی کرتی سیاہ لہنگے پہن کر خراماں خراماں چلتی۔ تو  
 ایک ایک قدم پر سو سو فتنے بیدار کرتی۔

نشاہ — دوشیزگی کے اُس دور میں تھی، جو ایک دوشیزہ کو سراپا بنانا  
 بنا دیتا ہے۔ کہ اُسے کوئی جی بھر کے پیار کرے۔

وہ جوانی کے اُس دور سے گزر رہی تھی۔ جہاں ایک چاہنے والی کی جستجو  
 ہوتی ہے لیکن محبت کی ایک لغزش غم بھر کے لئے قعرِ مذلت میں گرا دیتی ہے۔۔۔۔۔  
 ربانی گاؤں بھر میں بانٹا بھیلہ جوان تھا۔ ساڑھے چھ فٹ سے زیادہ قد۔  
 گٹھیلا جسم۔ کبڑی۔ رستہ کشی اور دیگر کھیلوں کا بہسا دُر کھلاڑی۔ ہمتوں کا جوان  
 علاقہ بھر کا مشہور چور (چور می کو جانگی معیوب نہیں سمجھتے) جب ریشم کے کنارے  
 والی لنگی باندھ کر اور بالوں کو تازہ تازہ مکھن سے چھڑا کر گلیوں میں نکلتا۔ تو گاؤں کی  
 دوشیزائیں کنکھیوں سے اُس کی طرف دیکھتی تھیں

نشاہ کو ربانی — اور ربانی کو نشاہ سے محبت تھی۔  
 لیکن یہ محبت پاکیزہ نہ رہ سکی۔ اُن کے پاؤں لٹکھڑا گئے۔

اور محبت معصیت میں بدل گئی۔

عشق اور مشک چھپائے کبھی چھپ نہیں سکتے۔ نشہ اور ربانی کی اس محبت کا چرچا گاؤں والوں کی زبان پر تھا۔ اور ہر دیکھنے والی آنکھ یہ دیکھنے کے لئے سراپا انتظار تھی۔ کہ اس عشق کا انجام کیا ہوگا۔

رات تیرہ و تارہ تھی۔ گگاؤں کی آبادی پر ایک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ لیکن کتوں کے بھونکنے کی مسلسل آواز اس سکوت شب کو تار تار کر رہی تھی۔ نشہ کے گھر کے تمام افراد گہری نیند سو رہے تھے۔ لیکن وہ بیدار تھی اور اس لمحہ کا انتظار کر رہی تھی جب ربانی آئے اور وہ اس کے ساتھ فرار ہو جائے۔ وہ اس گھر کو جہاں پیدا ہوئی اور پل کر جوان ہوئی۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔ الوداع کہنے کے لئے تیار تھی کسی نے لاشی سے پھیر کو اوپر اٹھایا۔ اور ساتھ ہی کھانسنے کی آواز آئی۔ نشہ ننگے پاؤں اٹھی۔ اور آبجینہ نام و ناموس کو چکنا چور کرتی ہوئی تاریکی میں گم ہو گئی۔

صبح جب گھر کے لوگ بیدار ہوئے تو نشہ کی چادر پانی کو خالی دیکھ کر حیران و ششدر رہ گئے۔ چڑیا پنجرے سے اڑ چکی تھی۔

بوڑھے شعبان نے سر پیٹ لیا۔ اور نشہ کے بھائیوں کے سینے میں آتش انتقام کے شعلے بھڑکنے لگے۔

شیر لانے اپنی برادری کے نوجوانوں کو اکٹھا کیا۔ انتقام کے لئے مشورہ ہوا۔  
 جھلوں نے انگڑائیاں لیں بہتیں بیدار ہوئیں۔ غیرت جاگی۔ عزائم نے قدم بڑھائے  
 ڈھول کی آواز نے گاؤں والوں کو ہوشیار کر دیا۔ ڈھول کی دھپ دھپ کے  
 ساتھ ساتھ کتے بھونک بھونک کے آہواے حشر خیز لمحہ کی پیشین گوئی کر رہے تھے۔

دونوں طرف سے کڑیل نوجوان ہاتھوں لاثمیاں لیکر نکلے۔ اور ایک دوسرے  
 پر ٹوٹ پڑے۔ لاثمیاں سر دوں پر برس رہی تھیں۔ فریقین کے آدمی تیوراً کر گڑو  
 اور بے سُدھ ہو گئے۔

تمام آبادی پرستناٹا چھا گیا۔ ہر شخص ہر اس ہر نفس متوحش۔ سات لاشیں  
 — مالک تیری پناہ —

کمالیہ کے تھانے میں چوکیدار ہانپتا ہوا پہنچا۔ اور تمام واقعہ ہیڈ  
 محترمہ کے کم و کاست بیان کیا۔

آن کی آن میں سُرخ سُرخ صافے والے جائے وقوعہ پر آمو جو دھوئے۔  
 نمبر دار اور چوکیدار ادھر ادھر دڑنے لگے۔ لاشیں ہسپتال میں بھجوا دی گئیں۔ مرنے  
 والوں کے نزعی بیان قلمبند کئے گئے۔ فریقین کے کئی آدمی گرفتار ہوئے اور عدالتی  
 کارروائی کی ابتداء شروع ہوئی۔

ساہیوال منگلگری کی جیل میں اس خونیں ڈرامے کا ڈراپ سین ہو رہا تھا احاطہ  
 جیل کا ذرہ ذرہ اپنے دامن میں قیامت کا فتنہ لئے ہوئے تھا۔ تختہ دار نصب ہو چکا

اور پھانسی کا پھندا ایک نہیں۔ بلکہ نوبانگے سجیلے نوجوانوں کی گردنوں میں پڑنے کے لئے بیکراہ ہو رہا تھا۔

ان نوجوانوں کی زندگی۔ جوانی۔ کے پھول مسل کر خاک میں ملانے کی تیاری ہو رہی تھی۔

جب ان کو تختہ دار پر کھینچا گیا۔ تو۔ اس حادثہِ خرمینہ کی یادیں سرزمینِ منگمری کے باشندے خون کے آئینہ بہا رہے تھے

لیکن نشاہِ اپنے حقیقی اور چچا زاد بھائیوں کی المناک موت سے بے پردا بے نیاز ہو کر اپنے آشنا کے ساتھ صدر بازار میں لڑی کمر بند خرید رہی تھی۔ لیکن اس کے تہم میں جہنم کے شرارے بکھرے ہوئے تھے۔ اور دیکھنے والے انگشت بدنداں تھے کہ یہ عورت ہے یا کوئی ناگن۔ شاید وہ نہ جانتے تھے۔ عورت کی فطرت کو۔

# بلبلان

یہ افسانہ آج سے چند سال پیشتر مجھے ایک بڑے سافرنے سنا ہوا تھا۔ یہ اس کی آپ بیتی ہے۔

آپ اسے صبح خیال کریں یا غلط سمجھے اس سے کوئی غرض نہیں لیکن یہ کس قدر دردناک ہے۔ اسکو

پڑھ کر اندازہ لگائیں۔

دسمبر کا مہینہ تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہلکی ہلکی ترشح ہو رہی تھی سرد ہوا کے جھونکے بدن میں کپکپا ہٹ پیدا کر رہے تھے۔ شام کا وقت ہو۔ بادل گھرے ہوں۔ ایسے میں کون بغیر کسی پابندی کے کام کرے چنانچہ میں نے کنواں چلانا چھوڑ دیا۔ اور بیلوں کی جوڑی کو کھول کر چھپر کے نیچے لاکر باندھ دیا اور آگ جلا کر تاپنے لگا۔ دو کھیتوں میں ایک بوڑھا شخص جس نے اپنی زندگی کی ساٹھ بھاریں دیکھی ہوں گی۔ سرد ہوا کے تیز جھونکوں سے نبرد آزما ہو آہستہ آہستہ لاٹھی ٹیکتا ہوا۔ دور سے آگ دیکھ کر میری جانب بڑھا آ رہا تھا میرے قریب آکر ”اسلام علیکم“ کہا اور ہٹیکر آگ تپانے لگا۔ ”بڑے میاں کہاں سے آ رہے ہو“ میں نے پوچھا۔

”خدا کی سز زمین سے“ اسکا یہ جواب اگرچہ عجیب و غریب تھا لیکن میں پوچھ ہی بیٹھا کہ ”آپ کہاں جا رہے ہیں“

”جہاں کا آبِ دوا نہ قسمت میں لکھا ہوگا“

میں اپنے دونوں سوالوں کے جواب سنکر حیران سا گیا چند منٹ تک وہ خاموشی سے بیٹھا رہا میں نے خُتہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ کش لگا لگا۔ اور یہ بات میرے ذہن سے اتر گئی کہ کس طرح دوست کا تذکرہ زیرِ بحث آیا تھا میں نے کہا تھا کہ ”دنیا میں کوئی سچا دوست ہی نہیں“ اور اُس نے کہا تھا ”دنیا سے سچے دوست کا وجود غنقا نہیں“

پھر اُس نے مجھے یہ آپ بیتی سنائی۔

”خجّم اور اشرف دو دوست تھے نہایت ہی گہرے دوست۔ اکٹھا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ ایک دوسرے پر جان فدا کرتے تھے۔ غرضیکہ ان کو ایک لمحہ کی جدائی بھی گوارا نہ تھی لیکن عورت ایسی چیز ہے جس کی وجہ سے ان دونوں دوستوں میں ہمیشہ کے لئے جدائی پیدا ہو گئی۔“

گاؤں کے نہروار کی لڑکی جس کا نام ”نازو“ تھا۔ اسکا باعث ہوئی۔ لڑکی کیسے تھی حُسن و جمال کی نادر ترین مورتی۔ اسکے پتلے پتلے گلابی ہونٹ مینائی گردن، لمبے لمبے سیاہ گھنگرے بال سفید رنگت کشمیر کے سیب ایسے گال۔ بادام کی سی آنکھیں جن میں شوخی چمکتی تھی۔ دیہاتی حُسنِ سادگی ہی میں ہوتا ہے۔ اسکو غازہ اور پوڈ کی ضرورت نہیں۔ دونوں اس کی زلف کے شکار تھے۔ اور وہ جب بھی پانی بھرے کنوئیں پر جاتی تو کنکلیوں سے ان کو اکٹھے جاتے دیکھتی۔ دونوں اسکو چاہتے تھے مگر ایک دوسرے سے اس کا اظہار نہیں کرتے تھے کہ مبادا آپس

میں شکر رنجی پیدا نہ ہو جائے

نجم دیکھ رہا تھا کہ اشرف اب اس سے ملنے سے گریز کرتا ہے۔ ان کی وہابی ملاقاتیں ختم ہو چکی تھیں لیکن وہ اسکا سبب نہ جان سکا۔

بہار کی چاندنی رات تھی۔ دریائے نور ٹھاٹھیں مار رہا تھا ہوا میں بھینی بھینی خوشبوئیں بسی ہوئی تھیں۔ وہ گھر سے نکل کر کسی جذبہ کے تحت کھیتوں کی طرف جا رہا تھا۔ وہاں اس کی آنکھوں نے وہ منظر دیکھا جسے وہ کبھی بھول نہ سکا۔

”نازاد! اشرف بیٹھے محبت کی باتیں کر رہے تھے۔“

”نازاد تم بھول جاؤ۔ نجم کو۔ میری ہونا۔ ہاں تم کہہ دو۔ صرف ایک بار۔“ نازو نے سر کو رضامندی کے طور پر ہلا دیا۔ نجم اس نظارہ کی تاب نہ لا سکا۔ اور وہاں سے دل برداشتہ ہو کر واپس آگیا

نجم دوسرے دن اشرف کے مکان پر پہنچا۔ آواز دی۔ ”اشرف۔ اشرف۔“  
”کون ہے؟“ اشرف نے اندر سے پوچھا۔

”اشرف میں نجم ہوں۔ ذرا باہر آنا۔ تم سے ایک ضروری کام ہے۔“  
اشرف باہر آیا۔

”اچھا دوست الوداع۔“ اشرف یُنکر چونک پڑا  
”میں خیر تو ہے۔“؟

”میں جا رہا ہوں اشرف۔“

”کہاں؟“

”جہاں قسمت لے جائے۔“

”نہیں۔ نہیں دوست ایسا ہرگز نہ کرنا۔ نجم مجھے اکیلا چھوڑ جاوے گا۔“

”نہیں تم اکیلے نہیں ہو گے۔ اشرف تمہیں اس کا نعم البدل مل جائے گا لیکن

اشرف میں تمہاری خوشیوں کو برباد نہیں کرنا چاہتا۔“ یہ کہہ کر نجم چلا گیا۔

دوسرے دن گاؤں کے بچے بچے کی زبان پر نجم کے چلے جانیکا چرچا تھا۔ لوگ اس کی وجہ معلوم کرنے سے قاصر تھے۔ وہ اشرف سے کبھی پوچھتے تھے لیکن وہ کیا بتاتا۔ نجم کے چلے جانے کے بعد اشرف چند دن تو اُداس رہا لیکن یہ امر مسلمہ ہے۔ انسان خوشیوں میں گزشتہ غموں کو بھول جاتا ہے۔ بھٹوڑے عرصے کے بعد اشرف اور نازو کی شادی ہو گئی۔ اور اُسے بھولے سے بھی یاد نہ کیا۔ اُنھوں نے اپنی دنیا کی بنیاد رکھ لی لیکن نجم کا جیون برباد ہو گیا۔ اُس کی آشاؤں پر سیاہ باد چھا گئے۔

بوڑھے نے اتنا کہہ کر سرد آہ بھری اور کھانستے ہوئے کہا۔ ”نجم کی زندگی برباد ہو گئی۔ اُسے اُسکے بعد شادی نہ کی۔ ماحول میں پڑمردگی کی روح سی ہوئی معلوم ہوتی تھی تمہیں معلوم ہو گیا ہو گا کہ وہ بے نصیب کون تھا۔ اگر نہیں تو سنو۔“ وہ میں ہوں جس نے دوست کی خوشی پر اپنے آپ کا میدان دیدیا۔ اپنی زندگی میں پہلی دفعہ تیز

اس راز سے آگاہ کر رہا ہوں شاید اب تو تمہیں یقین ہو جائیگا کہ کم از کم دنیا میں سچی  
محبت کا وجود عفا نہیں۔

بوڑھے کی آنکھوں سے چند قطرے زمین پر گر کر خاک میں مل گئے۔  
باہر زور کی بارش ہو رہی تھی۔ تند ہوا کے جھونکے دراز نہ دار گھسے آرہے تھے چنانچہ  
ان سے بچنے کے لئے بوڑھا ایک کونے میں دبک کر سو گیا۔

---

# وطن کا پیجاری

موہن بی، اے پاس کر چکا تھا۔ اور ایم، اے میں پڑھ رہا تھا بڑا بھائی بنک میں منیر تھا۔ اور اس سے چھوٹا بھی اکول کا طالب علم تھا۔ اگرچہ والدین بہت امیر نہ تھے لیکن گزارہ بخوبی چل رہا تھا اسوجہ سے کوئی فکر و غم نہ تھا۔ ناز و نعم میں پرورش ہوئی تھی۔ عادات سنوارنے میں ماں کا بہت حصہ تھا۔ موہن ہنس مکھ نوجوان تھا چہرہ پر ہر وقت مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ باپ کی بہت سی امیدیں اُس سے وابستہ تھیں۔ باپ خیر سال کرتا تھا کہ موہن ایم، اے پاس کر نیکیے بعد اگر ڈپٹی کسٹرنہیں تو ڈپٹی کلکٹر ضرور بن جائے گا لیکن کسے معلوم تھا۔ وہ تخیلاتی محلات جسے وہ عرصہ سے تعمیر کر رہا تھا۔ یکایک ریت کے گھر وندے کی طرح اُن کی آن میں مسمار ہو جائیں گے۔ وہ تمام سہانے خواب جھیں وہ مدت سے دیکھ رہا تھا۔ وہ خواب ہی رہ جائیں گے۔ اُن کی تعبیر کبھی سچی نہ ہوگی

---

مادر وطن کو آزادی دلانے کے لئے جدوجہد شروع ہو گئی تھی۔ آزادی وطن کے دیوانے شمع حریت پر پروانہ وار شمار ہونے کے لئے چلے آ رہے تھے۔ ایک گن

تھی، جو سب کو لگی تھی۔ اک آگ تھی، جو ہر دل میں سلگ ہی تھی۔ تمام قومی سپاہی امن اور عدم تشدد کے اصولوں پر کاربند ہو کر جیلوں کو آباد کر رہے تھے۔ ”مادرِ وطن کو آزاد کرنا۔“ انقلاب زندہ باد“ کالغہ عوام الناس کے کانوں سے گونج کر کالج کے نوجوانوں تک پہنچ گیا تھا۔ موہن نے اپنا نام رضا کاروں میں درج کر لیا۔ کانغہ کے ایک محلے پر دستخط کرنے سے مستقبل تاریک ہو گیا۔ اندھیری رات کی طرح باپ کی درخشاں امیدوں پر کابل ایسی سیاہ گٹھائیں چھا گئیں۔ پروفیسر نے ہتیرا سمجھایا۔ دوستوں نے لاکھ مکتبیں سمجھتیں کیں۔ کہ وہ اس ارادہ سے باز آئے لیکن سب اثر۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں لیکن جس نے بھی سنا۔ کہا ”مستقبل تباہ کر لیا“

”دُنیاوی جاہ و جلال“ اور ”فرض“ میں کشمکش ہو رہی تھی۔ کیا یہ ہمارا فرض نہیں؟ کہ ہم مادرِ وطن کو آزاد کرائیں۔ اُسے حقیقت معلوم تھی۔ ”جب تک ملک آزاد نہ ہوگا ہم سر بلند نہیں کر سکتے۔“

موہن جب چار کر کے گھر آیا تو ماں کو منتظر پایا۔  
”کیوں خیر تھی موہن۔“

”ہاں“

”آج دیر سے آئے ہو۔ میں بڑی دیر سے تمہارا انتظار کر رہی تھی کھانا ٹھنڈا ہوا جا رہا ہے۔“ اتنا کہہ کر ماں نے کھانا لاکر موہن کے آگے رکھ دیا لیکن اس نے ابھی ایک دو نواٹے ہی کھائے ہوں گے کہ نونو گھبرایا ہوا کمرہ میں داخل ہوا۔

”بابو جی! بابو جی“

”آخر کچھ کہو بھی۔“ موہن نے پوچھا۔

”آپ کو پتہ جی بلا رہے ہیں۔“

”کہو کھانا کھا کر آیا۔“

”نہیں۔ ابھی ابھی بلا یا ہے۔ داروغہ جی سپاہیوں کو ساتھ لیکر مکان کے

باہر کھڑے ہیں۔“ تلاشی تلاشی کا کہہ رہے ہیں۔“

”تلاشی۔“ یسندر موہن کی ماں چونک اٹھی۔ موہن نے ماں کی طرف دیکھا۔

اور ایک ہی نگاہ میں بھانپ لیا۔ اگرچہ وہ زبان سے کچھ نہیں کہنا چاہتی لیکن

موہن نے اُس کی نظروں سے معلوم کر لیا تھا۔ جیسے وہ کہہ رہی ہے۔

”موہن اگر تم۔۔۔۔۔“

اور موہن باپ کے کمرہ کی طرف چلا گیا۔

تلاشی میں داروغہ جی کے ہاتھ تو کچھ نہ لگا۔ لیکن موہن کی گرفتاری کا وارنٹ

بھی تھا۔ اس نے ماں کے قدموں پر سر رکھ کر رخصت ہونے کی اجازت طلب کی۔

ماں نے موہن کو مخاطب کر کے کہا۔ ”اپنے قول کا پاس کرنا۔ ایشور تمہارا

بھائی۔“ یہ کہہ اُسے چھاتی سے لگایا۔ اور پھر آنسوؤں کے سیلاب کو روکنے

کی ناکام کوشش کرنے لگی۔ باپ نے سکوت کو توڑتے ہوئے کہا۔

”آخر الزام کیا ہے؟“

”مجھے خود معلوم نہیں لیکن آزادی طلب کرنا سب کے بڑا جرم ہے۔ پرسوں میں نے لیکچر کی تھی۔ اور کہا تھا۔ کہ ہمارا فرض ہے کہ ہم کھڑے نہیں۔“

باہر سے دار و فرجی نے کڑکتی ہوئی آوازیں کہا۔ ”جلدی کرو۔ دیر ہو رہی ہے مومن پر ہم کر کے کمرہ سے باہر نکل آیا۔ اور دار و فرج صاحب نے اُسے اپنی سمیت میں لے لیا لیکن کمرہ میں بوڑھا باپ جُدائی کا صدمہ برداشت نہ کر سکا۔ اور یہوش ہو گیا۔

مومن کو ڈیڑھ سال کے لئے پابند سلاسل کر دیا۔ رات کی وقت کبھی کبھی اسے خیال آتا تھا۔ نہ جانے باپ کا کیا حال ہوگا۔ ماں پر کیا گذرتی ہوگی۔ خاندان کی امید مجھ سے وابستہ تھیں لیکن دل سے ایک آواز نکلتی تھی

”فرض کی ادائیگی سب سے مقدم ہے۔“

جس طرح زبان سے نکلے ہوئے الفاظ اور کمان سے نکلا ہوا تیر دایں نہیں آسکتا۔ اسی طرح اب میں اس عہد سے نہیں پھر سکتا جو میں نے بھرے مجمع میں کیا تھا لیکن ابھی قید ہوئے دو ہی ماہ گذرے تھے۔ کہ گھر سے خط آیا کہ باپ کی حالت خطرناک ہے۔ اُسے خواہش ہوئی۔ کاش چند لمحوں کے لئے اُسے آزادی مل جائے تو بچھی کی طرح اڑ کر باپ کے قدموں پر سر رکھ کر اپنے قصوروں کی معافی مانگ لے۔ لیکن ممکن نہیں تھا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کا خاموش دھاارواں ہو گیا۔

ایک مہینہ سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا۔ اُسے گھر سے کوئی خط نہیں آیا تھا۔

وہ سر جھکائے سوچ رہا تھا کہ ملک و قوم کے لئے میں اپنے آپ کو قربان کر سکتا ہوں لیکن گھر کے دیگر افراد کو تکلیف دینا کہاں کا انصاف ہے۔ اچانک ہی کوٹھری کا دروازہ کھلا۔ اسکا بڑا بھائی سوہن اس کے سامنے کھڑا تھا۔ موہن گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ اس نے پر نام کر کے پوچھا ”گھر کا کیا حال ہے؟“

”تمہارے بغیر تو گھر سونا ہو گیا ہے۔“

”پتا جی“ — ”آہ۔ وہ — تو“ یہ کہتے ہوئے سوہن کی آنکھوں پر ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ موہن بھی دلدوز ہچکیاں لے رہا تھا۔

”آپ کا کیسے آنا ہوا؟“

”میں تم سے بھیک مانگنے آیا ہوں۔ مجھے مالوس نہ کرنا۔“

”ماں کا کیا حال ہو؟“ — ”اسی لئے تو میں آیا ہوں۔ وہ کوئی دم کی مہان ہے۔ اور زبان پر ہر وقت تمہارا ہی نام ہے۔“

”کیا کہنا چاہتے ہو۔ جلد کہو۔“ موہن نے روندھے ہوئے گلے سے کہا۔

”اسپر دستخط کرو۔“ — ”معافی نامہ“

”چھی چھی چھی۔ بیٹا مجھ سے ایسا نہ ہو سکتے گا ماں سُننے گی کہ میں معافی مانگ کر آیا ہوں۔ تو وہ شاید میری منہ تک دیکھنا گوارہ نہ کرے۔ ماں نے نصحت ہوتے وقت کہا تھا۔“ اپنے قول کا پاس کرنا۔ پتا کی موت کی خبر تک نہ بھجوائی۔ شاید یہ قدم میں لغزش نہ آجائے۔ بھیا! جاؤ۔ ماما کو میرا پر نام کہنا یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

چمر - چمر - چمر - وارڈز نے آہنی دروازہ بند کر دیا۔ اور مومن کو  
تہائیوں میں غرق چھوڑ دیا۔

ماں کی تصویر اُس کی آنکھوں کے سامنے تھی۔ پھر دار و نغ اور سپاہی نظر آئے  
ماں نے چلتے وقت جو نصیحت کی تھی، اُسکے الفاظ ابھی تک کانوں میں گونج رہے  
تھے۔

---

# قیدی

”قیدی نمبر ۱۳۔“

گنتی کرنے والے وارڈ نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

”حاضر!“

قیدی نے دھیمی سی آواز میں جواب دیا۔

یہ نو وارڈ قیدی چند ہی دنوں سے میرے ساتھ کی کوٹھری میں آیا تھا۔

یہ نوجوان تھا۔ لیکن اسے جوان کہنا جوانی کی توہین تھی۔

پڑمردہ زرد چہرہ۔ دھسنی ہوئی آنکھیں۔ ڈاڑھی بڑھی ہوئی

لیکن کل تو اس نے اسقدر مدھم آوازیں جواب نہیں دیا — میں نے دلی

دل میں کہا

دارڈر نے میری کوٹھری کے قریب اگر قیدی نمبر ۱۴ پکارا

”حاضر!“

اتنا کہہ کر میں نے اُسے آواز دی۔ ”جمعدار“

”کیوں کیا ہے؟“ اُس نے اکڑ کے جواب دیا۔

”کیا قیدی نمبر ۱۳ بیمار ہے۔“

”مجھے خبر نہیں۔ اس سے پوچھ لو۔“

”میں خیالات کی دنیا میں گم ہو گیا۔ یہ ہے کون؟ کیسے قید ہوا؟“

میں اس سے صبح پوچھ لوں گا۔ اگر کوئی موقع ملا تو۔۔۔ میں اسے ٹھہراؤں گا۔

”نادان! جب تم زندان میں ہو۔ دکھ درد کو چھوڑ دو۔ یہ تو ماحول کو اور بھی ادا اس بنا دیتے ہیں۔ پھر ادا اس ہونے سے کیا فائدہ؟“

پھر مجھے مٹا اس قیدی کا خیال آیا۔ جو ہر وقت مسرور رہتا ہے۔  
چکی پیستے وقت کتنے مزے سے گاتا ہے۔ آج تک کسی نے بھی اسے ادا اس  
نہیں دیکھا۔ دیہاتی سا گوارا ہے لیکن دکھ سکھ کے فلسفے کو خوب جانتا ہے۔  
— میں تو خود دکھ سکھ کے فلسفے کو بھول جاتا ہوں۔

اور میرا ہمایہ قیدی تو شاید  
یہ سوچتے سوچتے مجھے میند آگئی۔

اسے خوش قسمتی سمجھیے یا اتفاق پر محمول کیجئے۔ یہ آپکو اختیار ہے۔ کہ میری  
اور سعادت (قیدی نمبر ۱۳ کا نام) کی مشقت چکی خانہ میں لگی۔  
میں نے اس سے پوچھا ”تم کل بیمار تھے؟“  
”نہیں۔“

”میں نے تو یہی سمجھا۔“

ایک طرف برق انداز کے کوڑے کی تڑپاٹ پڑاٹ کے ساتھ جھنجھوں کی آواز  
آ رہی تھی میں نے بھی ڈر کے مارے چلی کوتیسز کر دیا۔ اور وہ جلدی جلدی  
ہٹا اکٹھ کرنے لگا۔

جب وہ جابر انسان چلا گیا۔ تو میں سعادت سے یوں گویا ہوا۔  
”تم آداس کیوں رہتے ہو؟“

”اور یہاں خوش ہی کون رہ سکتا ہے۔“

”تکلیف اتنی اذیت دہ نہیں جتنا کہ اسکا تصور۔“ میں نے جواب دیا  
”اور جب ہر طرف تکلیف ہی تکلیف ہو۔ تو پھر۔“

میں نے کہا سعادت میری جانب دیکھو مجھے پابند سلاسل ہوئے دو برس  
ہو چکے ہیں۔ اور میں نے ابھی ۳۶۵ + ۳۶۵ + ۳۶۵ + ۳۶۵ + ۳۶۵  
گویا ایک ہزار سات سو پچیس دن یہاں گزارنے ہیں لیکن میں تمہاری طرح  
اگر آسٹو ہبساؤں تو زندگی کا ایک ایک لمحہ وبال جان ہو جائے۔ اور تمہیں کتنی  
سزا ہوئی ہے۔

”دو سال۔“

”واہ یہ دو سال تو آٹھ جھپکتے ہی گزر جائیں گے۔“

میں نے ایک ادھیڑ عمر کے قیدی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔  
”اے عمر قیدی سزا ہوئی ہے لیکن دیکھو کس قدر ہشاش بشاش ہے۔“

اور سچ پوچھو۔ تو رنج و غم انسان خود پیدا کرتا ہے۔  
اُسے اک خیال ڈھارس بندھا رہا ہے۔ اور وہ ہے آنادی کا خیال۔  
لیکن اگر اسے یہ معلوم ہو جائے کہ زندگی کا چراغ زندان میں ہی گل ہو جائیگا۔ تو

جب تمام قیدی مخموری دیرستانے کے لئے بیٹھ گئے۔ تو میں نے کہا  
”سعادت تمہیں سزا کیسے ہوئی؟“  
”لو سنو“ یہ کہتے ہوئے وہ گویا ہوا۔

”میں کپڑے کی مل میں مزدور تھا۔ یہ ایک بڑی بھاری مل ہے۔ کوئی ایک  
ہزار کے قریب مزدور کام کرتے ہیں۔

نانٹ شفٹ بند ہونے کی وجہ سے دو صد کے قریب مزدور بیکار ہو رہے  
تھے۔ بہت سے اشخاص کو نوٹس مل چکے تھے۔ اور باقی مزدوروں کی کشتی حیات  
زندگی اور موت کے سنگم پر پہنچ چکی تھی۔

مزدوروں کا ایک وفد مالک کے پاس ملنے بھی گیا۔ لیکن اسے باریابی نصیب

نہ ہو سکی

عرباں تن۔ فاقہ کش۔ انسانوں کے اس گردہ کو کوٹھی کے احاطہ کے قریب  
بھی نہ پھینکنے دیا گیا۔

مزدور کہتے تھے۔ مزدوری کم کر دو۔ مزدوروں کے بچوں کو روٹی ٹکے ٹکڑے  
سے محروم نہ کرو۔ لیکن بے سود۔

کارخانہ میں ہڑتال ہو گئی۔ جلوس پُر امن طریقہ پر بازاروں میں سے گذرنا ہوا۔  
امیروں کی سرٹک کی طرف جارہا تھا۔

مزدور روٹی مانگتے جا رہے تھے لیکن انھیں کیا ملا —————  
سربایہ داروں کے محافظ۔ ہاتھوں میں لاثھیاں لئے، گدھوں کی طرح  
ارد گرد منڈلا رہے تھے۔

شام کے وقت شہر کے باہر سڑک گراؤنڈ میں مزدوروں کی ہمدردی میں ایک  
جستماع عظیم ہوا۔ میں بھی مزدور تھا۔ میں نے مزدوروں کی حمایت میں تقریر کی اور  
کہا۔

”غریبوں کے دبانے سے غریبی دب نہیں سکتی ———“  
ہجوم کو مشتعل کرنے کے الزام میں مجھ پر مقدمہ چلا۔ اور دو سال کی قید  
ہو گئی۔“

”یہ کوئی نئی بات نہیں۔ دوست! میں نے کہا۔  
سعادت نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ ”مجھے اس قید کی پرواہ نہیں لیکن آہ  
———— دو پاک روئیں ——— میری جدائی میں تڑپ تڑپ کر اس جہان کو  
نصرت ہو گئیں جب میں حوالات میں تھا۔

نتھنا ”خجم“ ایک ہفتہ کے اندر گھل گھل کر مر گیا۔ یہ کہتے ہوئے سعادت کی آنکھیں  
آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ پھر وہ خود ہی بڑبڑانے لگا۔  
”اچھا ہوا۔ بہت اچھا ہوا۔ اس کی مصوم روح قفس خاکی سے پرواز کر گئی۔“

”مزدور کا بچہ مزدور ہی ہوتا ہے۔“  
اسکے بعد مجھے ”رضیہ“ کا کوئی خط نہیں ملا۔ لیکن کل جیلر نے بلا کر یہ خط دیا۔ آنا کہہ کر  
اس نے ایک لفافہ میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔

مقام  
تاریخ

میرے سرتاج

اپنی رضیہ کا الوداعی سلام قبول کرو۔  
زندگی کا چراغ۔ چراغِ سحری کی طرح ٹٹا رہا ہے۔ اب یہ بجھنے کو  
قریب ہے۔ بالکل قریب۔ صرف چند لمحوں کے بعد آپ کی رضیہ آپ  
سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو جائے گی۔ مجھے ایک غم ہی جو تا حشر رہے  
گا۔ کہ دم آخر۔ میری جان آپ کے قدموں پر نہ نکلی۔ لیکن قصا  
و قدر کو یہ منظور نہ تھا۔ مجھے معاف کر دیجئے جس وقت یہ خط آپ کو  
ملے گا۔ آپ کی رضیہ ابدی نیند سو رہی ہوگی۔“

کوئی دم کا مہماں ہوں ادا ہل محفل

چراغِ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں

”بخم“ کی معصوم روح مجھے لینے کے لئے آگئی ہے۔ الواع

آپ کی

”رضیہ“

خط پڑھ کر میری آنکھوں نے سادون بھادوں کی جھڑپاں لگا دیں۔ اور سداوت  
بھی بچوں کی طرح رونے لگا۔

اب بھی جب کبھی میں ۱۳ کا ہندسہ پڑھتا ہوں۔ تو مٹا مجھے قیدی نمبر ۱۳ کی  
کی داستان یاد آجاتی ہے۔ اور روح پر ایک ناقابل بیان اُدا سی چھا جاتی ہے۔

---



کڑا کر کے یوں گویا ہوا۔

”ہجومر میں کھد مت کروں گا۔ میں آنا اسان پھر اموس (احسان فراموش) نہیں۔ اور ہوں بھی میں بے کسور۔“

خدمت کا لفظ منکر سینٹری انپکٹر صاحب کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔  
”چھدو ہم کیا کریں۔ صاحب کا حکم ہی ایسا ہے۔ آگے بھی تم خدمت کرتے ہی رہتے ہو۔“

یہ الفاظ نہ تھے۔ اک تیر تھا جو اُسکے دل کا پار ہو گیا۔ چھدو نے یہ بات سنی اور ایک سرد آہ بھری۔ وہ بات کی تہہ تک پہنچ چکا تھا۔ مگر آٹھ روپے ماہوار تنخواہ میں سے وہ داروغہ صاحب کے حرص کی آگ کیسے بجھا سکتا تھا۔ گھر کے چار افراد کے علاوہ بالیک جی کے مندر کے پجاری کی روٹی بھی تو اُسکے ہاں سے جاتی تھی۔ ابھی کل ہی تو کالا سنگھ نے اُسے کو ٹھری خالی کر دینے کو کہا تھا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ

تنخواہ دیر سے ملی۔ اور وہ کرایہ بروقت ادا نہ کر سکا۔  
وہ نامراد دوا پوس ہو کر گھر کی طرف چل دیا۔ آہ وہ کتنی امیدیں لیکر آیا تھا۔ وہ سب آن کی آن میں ریت گھر وندے کی طرح برباد ہو گئیں۔

شام کی سیاہی سرعت سے چھا رہی تھی۔ ایسے جس طرح نیکی پر بدی کی طاقت نہایت جلد ستولی ہو جاتی ہے۔ اور غریب چھدو۔ سوسائٹی کا ٹھکرایا ہوا

انسان سر جھکائے سڑک پر آہستہ آہستہ قدم اٹھائے جا رہا تھا۔ ایک عظیم الشان کوٹھی میں سے برقی قمقموں کی روشنی چھین چھین کر آرہی تھی۔ ریڈیو کا دلنواز غمہ فضا میں ارتعاش پیدا کر رہا تھا۔ لیکن چھدو کے لئے ان میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اُس کی دُنیا پر کا جل ایسے سیاہ بادل چھا گئے تھے۔ اُس کی دنیا تہہ وبالا کیجا رہی تھی۔ اس کیلئے سُست و خوشی کی تمام راہیں سد و دگر دی گئی تھیں۔ اُسے اور اُسکے گھرانے کے افراد کو دکھ درد کی دنیا میں سانس لینے کے لئے چھوڑ دیا گیا تھا اور اگر وہ حرف شکایت زبان پر لائے۔ تو اسکے لئے دھکے۔ گالیاں۔ طمانچے اور بوٹ کی ٹھوکریں تھیں۔

”نرو میرے لال۔ جنمائے بچے کو پیار کرتے ہوئے کہا۔ لیکن بچہ برابر آم۔ آم۔ کی رٹ لگا رہا تھا۔“

”تیرا باپو ابھی آم لاوت ہے۔“

اس طرح کی باتیں کر کے جنمائے اپنے بچے بیتل کو بہلا رہی تھی لیکن بالک ہٹ مشہور ہے۔ وہ برابر ضد کئے جا رہا تھا کہ اتنے میں چھدو دگر دن جھکائے۔ دھیرے دھیرے آم آد کھائی دیا۔ ایسے جس طرح سپاہی کسی مجرم کو پابجوالاں جیل خانہ کی طرف لے جا رہے ہوں۔ اور وہ یہ سوچ رہا ہو کہ اب کیا ہوگا۔

جنمائے اپنے پتی کو جب اس طرح دیکھا تو اسکا ماتھا ٹھنکا کہ بھگوان خیر کرے آج بڑے سُست سُست قدم اٹھا کر چلا آرہا ہے۔

اس سے پہلے تو وہ دُور ہی سے بکارتا آتا تھا ”چودھری سیٹل پرساد۔ او  
چودھری سیٹل پرساد۔“ لیکن آج یہ خاموشی بے سبب نہیں۔ ”کہو کیا بات ہے۔ خیر تو؟“  
جمنائے پوچھا۔

”خیر کہ ہے کی“ چھدو کی آواز میں رقت پیدا ہو گئی لیکن وہ جلد ہی سنبھل گیا۔  
”بابو جی نے نوکری سے جواب دیا۔“

یہ سنتے ہی جمناپر تو جیسے بجلی گر پڑی آنکھوں سے آنکھوں کا سیلاب جاری ہو گیا  
اوجب آنسوؤں کی ندی کا سیلاب کچھ کم ہوا اور پانی پلوں کے کناروں کو عبور کرتا ہوا  
گذر گیا جسرت دیاس کی متلاطم ندی کا طوفان گھٹ گیا۔  
جمنائے چھدو سے پوچھا۔ ”آخر بات کیا ہوئی؟“

”کچھ بھی نہیں۔“ چھدو نے جواب دیا۔

”پھر بھی۔“ جمنائے دوبارہ پوچھا۔

”آج سیرے سیرے (سویرے سویرے) جمدار نے کہا۔ تم کو بابو جی پا سنجو  
دپھتر (دفتر) میں بلاوت ہیں۔ وہاں گیا تو نوکری سے جواب مل گیا۔“  
جمنائے آہ بھرتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا اور کہا ”بھگوان تیری مرضی۔“

بچہ آم کے لئے بلک بلک کر سو گیا تھا۔ لیکن کسی کو اس کا خیال نہ آیا جب انہوں

میاں بیوی دل کا بخار نکال چکے تو جمنائے شوہر سے کہا۔ ”اب کیا ہوگا؟“  
چھدو بولا۔ ”ہوگا کیا۔ یہی کہ پھاڑوں مرے گئے۔“

اتنا کہہ کر وہ خیالات کی رودیں بہہ گیا۔ اور پھر وقفہ بڑبڑانے لگا۔ جیسے کوئی ہولنا خواب دیکھ کر چونک اُٹھے۔

اگرچہ الفاظ یہ نہ تھے۔ مگر اُن کا مطلب یہی تھا۔

”پنگلی میں سوچ رہا ہوں بھگوان کی پیسہ کیسی نیاری ہے۔ پنڈت جی بھی یہی کہتے ہیں اور میں بھی یہی خیال کرتا ہوں لیکن مجھے سمجھ نہیں آتی کہ بھگوان ظلم کرنے والوں پر کیوں خوش رہتا ہے۔ اس لئے کہ وہ مظلوموں کا خون چوس چوس کر اپنی طاقت میں اضافہ کریں کیسی ایہ نیا بھگوان کو پسند ہے۔ برہمن اور اچھوت کی تقسیم بھگوان نے کی ہے سرمایہ داری کی تخلیق خدا نے کی یا انسان نے“

جمنائے پرسنکر کہا۔ ”چھی چھی کیسی بات کرتے ہو۔“  
اور چھدو بڑبڑا کر چُپ ہو گیا۔

## بھکارن

رات مہیب اور بیوہ کے مستقبل کی طرح سیاہ تھی کبھی کبھی برق آتشی پردہ  
 سحاب سے اپنا ہیبت ناک چہرہ دکھا کر سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی آن کی آن  
 میں نظروں سے غائب ہو جاتی تھی۔ بارش دھائیں دھائیں کر کے پڑ رہی تھی۔ بازار  
 کی تمام دکانیں قبل از وقت بند ہو چکی تھیں۔ بازاروں میں کھیلنے والے تمام آوارہ لڑکے  
 بھی اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔ کتے بھی کہیں دکانوں کے تختوں کے نیچے دبے  
 پڑے تھے۔ سیر و قیام کا دروازہ بازار کی طرف کھلتا تھا۔ کڑکی دھنکی کڑکی دھنکی  
 پڑ رہی تھی ہیں گالز و رومی کے افسانوں کی کتاب پڑھ رہا تھا کہ ایک ایسی دروازہ پر شک  
 ہوئی۔ سچ پوچھئے تو میں سہم گیا۔ اور جب دوبارہ دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی تو میں نے  
 دل کڑا کر کے دروازہ کھولا۔ میں نے ایک بوڑھی بھکارن کو دروازہ کے ساتھ کھڑے ہوئے  
 دیکھ

اس کا لباس دریدہ اور بوسیدہ تھا۔ جو حاجت رفو سے بھی بے نیاز ہو چکا  
 تھا۔ وہ بارش میں شرابور تھی۔ سردی کے مارے اس کے دانت بچ رہتے۔ اس کے جسم  
 پر کپکپاہٹ طاری تھی۔ وہ بھوک سے مضمل تھی۔ اس کی خستہ حالت سراپا سوال تھی

نہ جانے میرے دل میں اُس وقت یہ خیال کیوں پیدا ہو گیا۔ اور اب میں ایک راحت محسوس کرتا ہوں اس چھت کے سایہ تلے جہاں اس رات کی ہولناکیوں سے محفوظ رات بسر کر رہا ہوں۔ اگر یہ بھکارن بھی اس خوفناک رات کے چند گھنٹے بسر کرے گی۔ تو میرا کوئی نقصان نہیں ہوگا

میں نے بھکارن کو کمرے میں آنیکی اجازت دیدی۔ ایک کپڑا اس کے تن ٹھکانڈ کو دیا جس سے اسکو سردی سے بہت حد تک نجات مل گئی۔ اس کے بعد میں نے شام کا کھانا، جو میں بھوک نہ لگنے کی وجہ سے نہ کھا سکا تھا جوں کا توں طشتری میں لا کر اسکے سامنے رکھ دیا۔ بڑھی بھکارن ہزاروں دعائیں دیتی ہوئی کھانے میں مصروف ہو گئی۔ اس درمیان میں غربت، اضمحلال، بدضمیمہ میں بھی بھکارن کے چہرے پر ایک عجیب جھلک ہو رہی تھی۔ اس کے اوضاع و اطوار ظاہر کر رہے تھے کہ وہ کسی اچھے خاندان کی فرد تھی، اگرچہ اب اسکا چہرہ ہجوم غم و آلام کی نمایاں تصویر تھا۔

میں نے بھکارن سے مخاطب ہو کر کہا ”تم مجھے کسی اچھے خاندان کی تم رسیدہ معلوم ہوتی ہو۔“ ”ہاں“ لیکن وہ بیکار چلا اٹھی جیسے کوئی مریض ہڈیاں کی حالت میں پکاراٹھے ”نہیں نہیں۔ مجھے اس بات کے کہنے کا کوئی حق نہیں، بلکہ میرے لئے اسکا خیال کرنا بھی گناہ عظیم ہے۔“ مجھے بھکارن کی ان باتوں سے دلچسپی سی پیدا ہوئی تھی۔ میرے دل میں تجسس پیدا ہوا۔ کہ میں اس کے گزشتہ حالات کو سنوں۔ میں یوں گویا ہوا ”تمہیں کس چیز نے اس حالت تک پہنچایا؟“

”آپ میری داستان نہ سنیں“

لیکن میرے پیہم اصرار پر وہ یوں گویا ہوئی  
 ”میں یہ نہ بتاؤں گی۔ میں کون ہوں۔ کس خاندان سے تعلق رکھتی ہوں۔ میں یہ  
 باتیں بنانا نہیں چاہتی۔ اور ان کی ضرورت بھی نہیں۔ صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ میں  
 بھکارن ہوں۔ در بدر کی ٹھوکریں کھانے والی بھکارن۔“

سنا یہ قدام ازل نے میری قسمت میں اندوہ و غم ہی و دلیت کئے تھے۔ میں  
 اس زندگی میں ایک دن بھی حقیقی چین و آرام نہ پایا۔ میں اس قدر گنہگار ہوں کہ میری سائرس  
 سے اس کمرہ کی فضا بھی کشیف اور گناہ الود ہو رہی ہوگی۔

ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے ہم  
 منہ دیکھ روٹے ہیں کس سبکسی سے ہم (نئون)

میری داستان اندوہناک ہے۔ دل کے تاروں کو چھپڑنے سے در دالم۔  
 سونڈرپ۔ آہوں اور نالوں کے سو کوئی دوسرا لگ پیدا نہیں ہوگا۔ میں بد نصیب  
 ابھی چارہ ہی برس کی تھی کہ مانا پر لوک سدھا گئیں۔ کاش میں بھی مری ہوتی۔ لیکن  
 یہ بدنامیاں۔ رنوائیاں۔ خواریاں کون برداشت کرتا۔ تپا جی نے وعدہ کیا تھا کہ میں  
 دوسری شادی نہیں کروں گا۔ لیکن چار ماہ کے بعد میری نئی مانا آگئیں۔

باپ کی الفت پاتا جانے کدھر چلی گئی۔ دن ہفتوں اور ہفتے مہینوں میں تبدیل  
 ہوتے گئے۔ میری عمر دس سال کی ہو گئی میرے لئے سوتیلی ماں کی ماں پٹ پٹ کی جھڑکیاں تھیں  
 گھر بھر میں مجھ سے کسی کو بھی ہمدردی نہ تھی مجھے دو دو دن کافاقہ ہوتا تھا۔ لیکن کسی کو  
 میری پرواہ نہ تھی۔ اب بھی جب وہ وقت یاد آتا ہے تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ میری عمر

پندرہ سال کی ہو گئی۔ میرا بدن نازک و مرمی تھا۔ موٹی موٹی سرنگیں آنکھیں گھنی اور لمبی لمبی لمکیں سیاہ گھنگرے یا لے بال۔ دانت موتیوں کی طرح صاف اور شفاف ہیں معصوم تھی۔ یاہن کی کھلی کی طرح معصوم اور پاک۔ ان ہی دنوں میری شادی کا چرچا تھا۔ اور اس سلسلہ میں میری ماما اور پتا کو درمیان بحث مباحثہ ہوا کہ تا تھا۔ میں صرف اس سے یہ اندازہ لگا سکی کہ پتا جی میری ماما جی کی بات ماننے سے انکار کرتے ہیں لیکن دنیا میں تریا ہٹ سب سے زیادہ شہور ہے۔ مجبوراً میرے پتا کو ہتھیار ڈالنے پڑے جب میں نے یہ سنا کہ میری شادی ایک بوڑھے سے ہوگی۔ مجھ پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا میری امیدوں کی دنیا تباہ و برباد ہو گئی۔ میں نے جانتا تھا کہ شاید شادی کے بعد میرے ارمان۔ میرے خوابوں کی تعبیر پوری ہوگی۔ لیکن تنہاؤں کا گھر و نذائبہ ہو گیا۔ خود غرض سوتیلی ماں نے روپیہ کے لالچ میں ادبے رحم باپ نے بے رحمانہ طور پر پتی کی خوشنودی مزاج کی خاطر مجھے جیتے جی اندھیرے غاریں دھکیل دیا۔ مجھے یاد ہے کہ شادی کے باجوں میں میری دہنی ہوئی چھین نکل رہی تھیں۔ شادیاں میرے لئے پیام مرگ تھے۔ ایک ساٹھ سالہ بوڑھے کے ساتھ مجھے بیاہ دیا گیا۔ میرا دل محبت کا مسمیٰ تھا۔ لیکن وہ یہاں مفتوحہ تھی۔ میں بد نصیب اپنی زندگی کے دن کاٹ رہی تھی۔ میں کن خوشیوں کا ماتم کرتی۔ میں نے خوشیاں دیکھی ہی کب تھیں۔ لیکن ابھی تک میری مصیبتوں کا انجام نہیں ہوا تھا۔ وہ بیمار ہوئے۔ اور ایسے بیمار ہوئے — کہ پھر جانبر نہ ہو سکے۔ اب میں ودھوا تھی — سو سائی میں ودھوا ہونا کتنا جرم ہے۔ ودھوا کا لفظ ہی مصیبتوں و دکھوں اور تکلیفوں کا مخزن ہے۔ سہائیں میرے سایہ سے نفرت کرتی تھیں۔

کنواریاں میرے پر تو سے پر ہیز کرتی تھیں۔ میں کسی تقریب میں شامل نہ ہو سکتی تھی مگر  
 بھر مجھے منحوس منحوس کہتا تھا۔ آہ ودھوا ہونا کس قدر عظیم گناہ ہے۔ کتنا بڑا جرم ہے  
 امیدوں کا چمن۔ آہ وہ میں نے لگایا ہی کب تھا۔ تاخت و تاراج ہو گیا۔ پھر میری  
 امیدوں پر۔ میرے مستقبل پر۔ سیاہ بادل چھا گئے۔ کہ میرا دیور حرص و آز کا پستلا  
 میرے حسن کی بہار کو لوٹا چاہتا تھا۔ لیکن میں نے بھی یہ ٹھان لی تھی کہ محصیت کی  
 زندگی بسر نہ کروں گی جب اس نے مجھے زیادہ تنگ کیا تو میں نے ایک بھیانک رات  
 کو گھر کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ دیا۔ میں نے ایک کپڑے میں چند زیورات اور کچھ نفیس  
 روپے باندھے اور اسٹیشن کی راہ لی۔ میرے قدم خود بخود اسٹیشن کی جانب بڑھ رہے تھے  
 میں نے ایک شہر کا ٹکٹ لیا۔ اور گاڑی پر سوار ہو گئی۔ رات بھر گاڑی سوائے چند  
 اسٹیشنوں پر ٹھہرنے کے فریٹے بھرتی ہوئی چلتی رہی اور صبح کو ٹھہر گئی۔ یہاں میں ایک  
 ودھوا آشرم میں داخل ہو گئی۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ شاید باقی دن آرام سے  
 گزر جائیں گے۔ لیکن مجھے ودھواؤں نے بتایا کہ تم جسے سونا سمجھ رہی ہو یہ تو پیتل  
 ہے۔ یہ ودھوا آشرم نہیں۔ بلکہ بدکاری کا اڈہ ہے۔ آہ نیم سائے بورڈ سے دھوکا کھا  
 گئی ہو جب تک تم جوان ہو۔ یہاں پناہ مل سکتی ہے۔ لیکن تمہیں یہاں اپنے جسم کو  
 خیر باد کہنا پڑے گا۔ تم کو فریب دیا جائیگا۔ یہ سنکر میرے ہوش و حواس گم ہو گئے۔ میں  
 دام میں گرفتار ہو چکی تھی۔ آزادی یہاں سے مشکل ہی نصیب ہوگی۔ یہاں ہم پر کڑی نگرانی  
 کی جاتی ہے۔“

آہ۔ وہ رات کس قدر ہولناک تھی۔

آسمان کیوں نہ پھٹ پڑا۔ زمین کیوں نہ دہل گئی۔ بجلیاں کیوں نہ ٹوٹ پڑیں۔ جس رات میری عصمت کی پاک دنیا کو زبردستی پامال کر دیا گیا۔

”میں خودکشی نہ کر سکی۔ مجھ میں اتنی بہت نہ تھی۔ میں نے سوچا کہ اب جب میری عصمت ٹپ چکی ہے۔ اب بازار اور آشرم ایک برابر ہیں۔ میں مزدوری نہ کر سکتی تھی۔ میرا جس میرے لئے دباں جان تھا میں نے خود داری اور عزت و ناموس کو بالائے طاق رکھنے کا ارادہ کر لیا۔ عورت گنی خاندانی ناموس گیا عصمت گئی۔ اب کیا باقی تھا؟ یہ کہہ کر وہ زار زار رونے لگی۔ باہر بارش ہو رہی تھی۔ کمرہ میں بھکارن کی آنکھوں نے جھڑپاں لگا رکھی تھیں۔

”ہاں تو میرے پاس ایک چیز تھی۔ وہ میرا حسن تھا۔ جوانی تھی۔ میں گناہ کے گڑھوں میں کود پڑی۔ بلکہ مجھے دھکیل دیا گیا۔ آپ کے اس سماج نے۔ اس سنہرے قوانین والی سماج نے۔

میرے حسن کی شہر بھر میں شہرت تھی۔ بڑے بڑے پارسا درپردہ میری ایک نگاہ التفات کے منتظر تھے۔ میرے ایک اشارہ پر جان تک نثار کرنے کے لئے تیار تھے۔ میرے دلیں انتقام کی آگ سلگ رہی تھی۔ میں نے سوسائٹی اس ظالم سماج کو انتقام لینا تھا۔ میں بھولے بھالے نوجوانوں کو اپنے دام میں گرفتار کر لیتی اور ان کے خون کا آخری قطرہ تک بھی پھونڈ لیتی۔ ان کی مائیں۔ بیویاں۔ میرے پاس آتیں۔ لیکن میں اپنے

دل پر پتھر رکھ کر ان کی التجاؤں کو ٹھکرا دیتی۔ میرے دل میں انتقام کے خوفناک شعلے ہر وقت بلند ہوتے رہتے تھے۔ بچانے میں نے کتنے خاندانوں کے چراغ گل کر دیئے کتنے ہی شادماں گھروں کو تباہ و برباد کر دیا۔ کتنی ہی سہاگنوں کو خون کے آنسو رلا۔ لیکن کب تک۔ میری جوانی کی شام پہنچی تھی جس دن ڈھل چکا تھا۔ ہزار بار وہ بے مال ہو جاتا۔ حرام رفت کے مصداق آئے۔ اور خرچ ہو گئے۔ پھر ایک دفعہ قدرت نے مجھے بھوک اور فاقہ کی دنیا میں آبا کر دیا۔ بھوک کس قدر ہولناک ہے۔ یہ کوئی مجھ سے پوچھے بھوک نے مجھے گناہ کے گرد ہے میں ڈھکیل دیا۔ اور اب بھوک نے بھیک مانگنے اور در بدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کر دیا۔ اب میں اور کبھی کیا سکتی ہوں یہ کہہ کر بھکارن نے ٹھنڈی سانس لی۔ اور خاموش ہو گئی۔ میں خاموش و ساکت اس درد انگیز داستان کو سنکر زندگی کے نشیب و فراز سوچنے لگا۔ میری آنکھوں کے سامنے سماج کی حقیقت آئینہ کی طرح عیاں ہو گئی۔

میرے دل میں جوش کوک بیواؤں کے متعلق تھے وہ رفع ہو چکے تھے۔ بارش تھم چکی تھی۔ مطلع صاف ہو گیا تھا۔ آسمان پر روشنی کی قندیلیں روشن ہو گئیں چاندنی کشتی اکاش پر دھیرے دھیرے کھینتا ہوا دکھائی دیا۔ بڑھیا بھکارن نے کہا ”لیجئے اب میں چلتی ہوں۔“

میں نے بہتیرا صرا کر کیا لیکن وہ نہ مانی اور چل دی۔ میں نہ معلوم کتنی دیر تک زندگی کے اس کشمکش اور سماج کے قوانین کے متعلق سوچتا ہوا سو گیا۔ لیکن علی الصباح جب میں بیدار ہوا۔ تو میں نے سنا کہ بازار میں دو

رگنڈیہ کہتے ہوئے جا رہے تھے  
”سماج کے قانون غریبوں کے لئے ہیں۔ امیروں کے لئے نہیں۔“

---

# دکھپ بھول

خورشید اپنے کمرے کی طرف لوٹا۔ وہ دل ہی دل میں اسٹائک کے افسانہ نمبر کے دلکش مضامین کے متعلق سوچ رہا تھا۔ جو اُس نے روانگی کے وقت ایک بکٹال سے خریدا تھا اور مطالعہ کے بغیر صرف فہرست مضامین دیکھنے کے بعد بکس میں بند کر دیا تھا۔ وہ اُسے تنہائی میں پڑھنے کا ممتی تھا۔ بجلی کے فیل ہو جانے کی وجہ سے ہوٹل میں ہر چہ اسو تار کی مسلط تھی۔ جون کے مہینے کی گرم شام تھی تپش کی وجہ سے بجلی کے پنکھے کی ضرورت بڑی طرح محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن بجلی خراب ہو چکی تھی۔ کیا باہر برآمدہ میں بیٹھنا باعث سکون نہ ہوگا۔ شاید اس حدت میں قدرے کمی واقع ہو جائے۔ لیکن پھر وہ کچھ سوچ کر اپنے کمرے کی جانب لوٹا۔ برآمدہ میں بھیانک تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ ٹارچ کی مدد سے روشنی میں اس نے ایک شوخ و سنگد و شیرازہ کو لا ابا لیا نہ انداز میں کٹہرے پر جھکے ہوئے سگرٹ نوشی میں مشغول دیکھا۔ اس کے سلگتے ہوئے سگرٹ کی روشنی اس طرح معلوم ہوتی تھی جیسے خوفناک سمندر کے طوفان میں روشنی کے پینا کرپیٹ ٹٹماتی ہوئی مدھم سی ہو۔ وہ شبِ خوابی کے ریشیں بھڑکیلے لباس میں ملبوس تھی۔ خورشید نے اس دو شیرازہ پر ایک اچھٹی ہوئی نظر ڈالی اور اپنے کمرے میں

آکر مسہری پریٹ گیا۔ اور سوچنے لگا۔ کہ شاید وہ اپنے کمرے میں چلی گئی ہو۔ اور میں برآمدہ میں اطمینان سے بیٹھ سکوں۔ پھر وہ سونے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ لیکن ایسی گرمی بیز نیند کہاں۔ آخر وہ کشیمر کے دلکش نظاروں کے تصورات میں محو ہو گیا۔  
دروازہ کے ہینڈل لگ گھومنے کی آواز نے اُسے یک بخت چونکا دیا۔ دروازہ کھلا۔

اور دلکش نسوانی آواز نے کسی کو مخاطب کر کے کہا  
”اندرا آ جاؤ۔ ہم رات برآمدہ میں بسر نہیں کر سکتے۔“

پھر سگرت سلگا یا اور ترشی سے کہا

”کب سخت ڈبیا میں اب ایک بھی دیا سلائی باقی نہیں۔“

یہ کہہ کر اس نے دروازہ کو بند کر کے چٹخنی لگائی اور ————— یوں گویا ہونی  
”دروازہ کے پاس ہی کونے میں ایک کرسی ہے میرا خیال ہے۔ میں اسکو ڈھونڈ سکونگی۔“  
کاش کمرہ میں روشنی ہوتی۔ اس اندھیرے میں چلنا پھرنا تو کجا سانس لینا ناممکن ہے۔  
ہر جگہ تاریکی کے بھوت ناچتے دکھائی دیتے ہیں۔

خورشید نے معاملہ کی صہلیت کو سمجھ کر بولنے کی سعی کی لیکن آواز اس کے  
حلق میں اٹک کر رہ گئی۔ عام طور پر ٹولون میں تقریباً ایک سا ہی فرنچیر ہوتا تھا اور ایک ہی طریقے  
پر آراستہ کیا جاتا تھا۔

کمرہ میں قدموں کی چاپ اس بات کی مدعی تھی کہ نو وارد نے کمرے کی کونے  
میں رکھی ہوئی کرسی کو معلوم کر لیا ہے۔ یا یہ اسے ڈھونڈ رہا ہے۔ اُسکا سگرتا بیچر  
مہ... ہر کمرے... رکھا تھا جو حکم مانتھا۔ اسکا بدن بسنے میں شراور ہو گیا۔

اور وہ یہ سوچنے لگا کہ اسے کیا کرنا چاہئے۔

اُسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اُس نے بے پروائی میں مارچ کہاں رکھ دی ہے اُس نے یہ بہتر سمجھا۔ کرجوں کا توں کمرہ چھوڑ کر باہر نکل جائے لیکن اسی لمحہ اس کے بستر کے قریب خوشخوار کتے کی غرغراہٹ زور سے سنائی دی۔ دفعۃً ایک باریک اور لکش آواز نے کتے کو کہا۔ ”ٹومی بیوقوف مت بنو۔“ لیکن خورشید بستر میں دبک گیا تھا اور اس کا دل بید مجنوں کی طرح لرزاں تھا۔ نوار دے کتے کو مخاطب کر کے کہا۔

”میں سوچ رہی ہوں کہ کیا وہ شرمیلا خبر و نو جوان جو ساتھ کے کمرے میں مقیم ہے۔ مجھے دیاسلانی کی ڈبیہ مستعار دے گا۔ کس قدر شرمیلا ہے۔

”ٹومی تم نے دیکھا تھا نا اُسے۔ وہ کس قدر حسین دکھائی دیتا تھا جبکہ میں اُسے ڈانگ بال میں دیکھا تھا۔ لیکن کتے نے اُسے اُن اُن کا کر کے زور سے سوس سوس کی جیسے کہ وہ سکار کی تلاش میں سرگرداں ہو۔ لیکن وہ لڑکی برابر کہے جا رہی تھی۔“ مجھے یقین ہے وہ نیلگوں رنگ کی جیسے بہار کے رنگ کے بادل، کار اسی ہی کی ہے۔ کاش ام بھی سری نگر تک اپنا سفر ایسی ہی شاندار موٹر میں طے کرتے۔ بجائے اس کے کہ نیکی میں ہچکولے کھاتے ہوئے سفر کریں۔ اور پھر ٹھنڈی گہری سانس سنائی دی۔ خورشید یہ سنکر مضحل اور متوحش سا ہو گیا۔ اس کا حلق خشک ہو گیا۔ اس نے بولنے ہی کی نہیں بلکہ زور سے چیخنے کی کوشش کی لیکن ایک لفظ تک نہ نکل سکا۔

دو شیرہ نے کہا۔ ”آہ۔ کس قدر وحشت ناک اور اُداس رات ہے۔ دیکھتی ہوں۔ شاید کبھی کی روٹھو دکر آئی ہو۔ بٹن کی ٹپک کی آواز آئی۔ اور دوسرے لمحہ

برقی روشنی نے کمرہ کو منور کر دیا۔

چند لمحوں تک کمرہ میں موت کی سی خاموشی طاری رہی۔ آخر دوشیزہ نے اس طلسمِ سکوت کو توڑا: ”اوہ۔ کیا یہ میرا کمرہ نہیں؟“ خورشید نے نیم باز آنکھوں سے کمرہ کا جائزہ لیا لیکن فوراً ہی آنکھیں بند کر لیں۔ کتنا خوفناک نظروں سے خورشید کی جانب دیکھ رہا تھا۔ جیسے ابھی حملہ آور ہوگا۔

”کیا مہربانی فرما کر کتے کو بٹانے کی تکلیف گوارا فرمائیں گی؟“

خورشید نے نتیجہ نہ انداز سے درخواست کی۔ وہ شبِ خوابی کے لباس میں تھا اور اس حدیثِ کذبائی پر شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔

”محترمہ۔ آپ غلطی سے دوسرے کمرے میں تشریف فرما ہیں۔“ خورشید نے کہا۔

”میرے مالک! کیا یہ کمرہ نمبر ۲۶ نہیں ہے؟“

لوہکی نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر منتشر اسباب کا جائزہ لیا۔

”نہیں یہ کمرہ نمبر ۲۷ ہے۔“ خورشید نے جواب دیا۔

”لیکن آپ نے پہلے کیوں نہ بتایا؟“

اس دلکش اور سرسلی آواز میں غصہ کی جھلک نمایاں طور پر نظر آرہی تھی۔

لیکن خورشید خاموش، دزدیدہ نگاہوں سے شرابِ جن سے سیراب ہو رہا تھا۔

”میں — میں گہری نیند سو رہا تھا۔ اس وقت بیدار ہوا۔ جب آپ نے

کمرہ میں روشنی کی۔“ اس کی آنکھیں خود بخود دُرُخِ زیبا پر اٹھ گئیں۔ دوشیزہ کے

گلاب سے رخسار۔ کالی کالی زلفیں آنکھیں گہری اور نیلگوں جھیلیں تھیں۔

تھیں۔ اُس کی رعنائی اور دلکشی کو دیکھ کر اسپر اسی حالت طاری ہو گئی۔ جیسے کسی نے اسکو سحر کے زور سے ساکت کر دیا ہو۔

”خیر کوئی مضائقہ نہیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ نے میری وہ تمام گفتگوئیں لی ہوگی۔ میں اکثر تنہائی میں کتے سے گفتگو کرنے کی عادی ہوں۔ یہ میری بہت بُری عادت ہے۔“ دوشیزہ نے کہا۔

”نہیں۔ میں گہری نیند سو رہا تھا۔“

”اس تکلیف کی محذرت چاہتی ہوں۔ آؤ ٹومی چلیں۔ شب بخیر۔“  
خورشید نے ایسا محسوس کیا۔ جیسے کہ وہ فردوسی خواب سے بیدار ہو گیا ہو۔  
اُسے معلوم ہوا۔ اسکا دل زور زور سے دھک دھک کر رہا ہے۔ اس کی حرکت اُسے صاف سنائی دے رہی تھی۔ اُس کی روحانی دنیا میں اُن اہدیں ایک انقلابِ عظیم پیدا ہو چکا تھا۔ اسپر اضطرابی کیفیت طاری تھی۔ وہ جھجکتے جھجکتے یوں گویا ہوا۔  
”ٹیکسی میں چھکے کھانے کی بجائے کیا آپ نیلگوں رنگ کی کاریں میرا ہمسفر بننے کا شرف بخشیں گی؟“

تمام رات وہ آرام سے نہ سو سکا۔ ہر آن اس کی تصورات کی دنیا بدلتی رہی۔  
دوشیزہ کی موہنی تصویر آنکھوں کے سامنے رہی۔

(پلاٹ ماخوذ)  
از انگریزی

# مُسکراہٹ

”نٹھی فریدہ کے نام“

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب دنیا جوان تھی۔ اس کی تخلیق کو بہت زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ آسمانوں پر انجم کی دیوی نے دیوتاؤں کی دنیا میں ایک پھل سی بپا کر رکھی تھی۔ یہ دیوی تھی۔ خوبصورتی کا پیکر۔ اگر دیوی ہی خوبصورت نہ ہو تو پھر حسین کون ہوگا۔ ہاں! تو دیوی کے حُسن کی یہ اک نامکمل سی تصویر ہے۔

اُس کی زلفیں لیلائے شب کی طرح سیاہ تھیں۔ نرگس اس کے چشم افوار افشاں سے بصارت حاصل کرتی تھی۔ ارغوانی کلیاں اس کے پرتو سے شگفتہ ہوتی تھیں اسکے نقرئی نغمے سُسنے کے لئے دیوتے بھی اڑتے ہوئے پھرتے تھے۔

تمام دیوتاؤں کے دل میں اس کے عشق کی آگ سلگ رہی تھی۔ ہر ایک اسکو حاصل کرنے کا متمنی تھا۔ اور بہت ممکن تھا کہ دیوتاؤں میں باہمی زفاہت کی وجہ سے ہنگامہ جنگ و جدال بپا ہو جاتا۔

لیکن دیوی کی عقلمندی نے اس تمام چپقلش کا خاتمہ کر دیا۔ دیوی نے کہا :-  
”مجھے آسمانوں اور زمینوں کی مسکراہٹوں میں جو سب سے زیادہ دلکش ہو، لا دیجئے۔ جو دیوتا میرا تختہ لانے میں کامیاب ہوگا۔ وہ یقیناً میرا حقدار ہوگا۔“

آکاش کے تمام دیوتا تیز رفتار بادلوں پر سوار ہو کر دھرتی اور آکاش پر مطلوبہ مسکراہٹ کی تلاش میں چل دیئے۔

بہار کا موسم تھا۔ پرشباب کیف آگئیں ہوائیں چل رہی تھیں۔ غنڈیپ بہار کی رنگین اور دلکش فضا میں گلستان کی رعنائیوں سے سحر ہو کر بے ساختہ گل خنداں کو چوم رہی تھی۔ مشرق کی سمت سے شاہ خا وراپنی سنہری رتھ پر سوار ہو کر نقرئی تیر برساتا ہوا ننو دار ہوا ہاتھا۔ ایسے میں اسکے معطر قطرے رنگین ہو رہے تھے۔ ایک دیوتا نے دیکھا کہ گلاب کی ایک ننھی شرمیلی کلی پتوں کی اوٹ میں سے مسکرا رہی ہے۔ دیوتا نے اس موقع کو غنیمت جانا۔ اور ننھی کلی کی مسکراہٹ اپنے دامن میں نہایت سرعت سے سمیٹ لی۔ اس نے خیال کیا۔ محبت کی بارگاہ ناز میں یہ تحفہ ضرور قبول ہوگا۔

✽

سورج دن بھر کی مسافت کے بعد پہاڑوں کی دلفریب چوٹیوں کے پار شفق کی رنگین داویوں میں کر دٹیں بدل رہا تھا۔ دریا کے پر سکون پانی میں ہلکی ہلکی بنفشی کرنیں منعکس ہو رہی تھیں۔ جیسے پانی میں آگ لگی ہو۔ دریا کی نرم دنازک لہریں کناروں کے بوسے لے رہی تھیں۔ اک حسین و جمیل دوشیزہ سراپا حسن جس کے حسن جہاں سوز سے شرمناک مہر عالم تاب بھی اپنا منہ چھپا رہا تھا۔

اور ایک خوب رو و جوان مردانہ حسن کا نایاب مجسمہ بشباب کی رعنائیوں کی منہ بولتی تصویر۔ اس کی باہوں میں باہیں ڈالے موخرام تھا اور یوں کہہ رہا تھا۔ ”خورشید میں نے تمہاری یاد اپنے دل میں بسالی ہے۔“

”میری حسین دیوی۔ میرے من کے مندر میں تم ہی پریم کے سنگھاسن پر جلوہ افروز ہو۔ کیا ہم رشتہ ازدواج میں منسلک نہیں ہو سکتے۔“

حسین دو شیزہ ان پُر فریب فقر و پر سکرا رہی تھی۔ اس کے لبوں پر محبت کے پھولوں کی مسکراہٹ کا بے پناہ سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اک دیوتا نے جو صبح سے ان لمحات کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ اس جوڑے کو دیکھا۔ اس نے حسین دو شیزہ کی مسکراہٹ کو سمیٹ لیا۔ اور اپنے دل میں امیدوں کی دنیا بسا لگا۔

عروس شام نے اپنے سیاہ گیسو بکھیر دیئے۔ آسمان پر تارے نمودار ہوئے

تھوڑی ہی دیر میں چنستان قدرت میں ہر جہاں سو نور کے پھولوں کی مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ دیوتا جو اپنے ساتھیوں سے ذرا کاہل تھا۔ اس نے اسکو زرین موقعہ سمجھا۔ اور اس مسکراہٹ کو سمیٹنے میں محو ہو گیا۔ اور دل ہی دل میں خیال کرنے لگا کہ ”انجم کی دیوی“ اس پیشکش کو ضرور ہی نوازے گی۔

ایک ننھا سا بچہ پنگورے میں ماں کی میٹھی میٹھی لوریاں سنکر نیند کی پریوں کے سین تہمتوں کے درمیان خوابوں کی حسین و جمیل وادی کی سیر کر رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر دلکش مسکراہٹ تھی۔ ایسے جس طرح بہار میں گلستاں کی نوشگفتہ کلی مسکراتی

ایک دیوتا جو بے نیل و مرام آسمان پر واپس جا رہا تھا۔ اچانک اس کی نظر اس معصوم سکراہٹ پر پڑی۔ اس نے جھٹ اسے سمیٹ لیا۔ تمام دیوتے اپنے اپنے بیش بہا نذرانے لیکر بارگاہِ جن میں حاضر ہوئے۔

”انجم کی دیوی“ نے تمام سکراہٹوں کا جائزہ لیا۔

اس میں سے اسکو معصوم سکراہٹ پسند آئی۔ اور اپنے نفرتی سنگھاس سے اٹھ کر دیوتا..... کے گھلے میں اپنی نازک مرمریں باہیں حائل کر دیں۔

---

## تین حادثے

گازی گلاب پور کے اسٹیشن پر رُکی اور میرے کمرہ میں ایک پیمبر چھپیں بس  
 کالو جوان داخل ہوا۔ اس کی آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ وہ لباس سے فارغ البال شخص  
 معلوم ہوتا تھا مگر وہ کسی خیال میں کھویا ہوا تھا۔ وہ میرے سامنے کی نشست پر بیٹھ گیا  
 جیب سے سگریٹ کیس نکالا اور سگریٹ سلگایا اور ایک لمبا سا کش لگاتے ہوئے  
 ایک دلفریب تبسم کے ساتھ مجھ سے مخاطب ہوا۔

”آپ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟“

”پریم نگر“ میں نے جواب دیا۔

پریم نگر کا نام سُکر وہ ایسا اچکی بول اٹھا۔

”تب تو میرا اور آپ کا ساتھ رہیگا۔ آپ کہاں قیام فرمائیں گے؟“

”میں اولین بار جا رہا ہوں کسی سرے سے‘ وغیرہ میں رہائش کا انتظام

ہو ہی جائیگا۔

لیکن میرے غریب خانہ کو کیوں رونق نہیں بخشتے؟“

میں نے ایک لمحہ تک توقف کیا کہ اپنے ہمسفر کی دعوت قبول کروں یا نہ

لیکن یہ دعوت کچھ ایسے غلوس سے ادا کی گئی تھی کہ میں اسے رد نہ کر سکا۔ اور میں نے  
بصد شکر یہ اسے قبول کر لیا۔

”بھلا اس میں شکر یہ ادا کرنے کی کیا ضرورت“

میرے ہمسفر نے زیر لب تبسم کے ساتھ کہا۔

”شکر یہ تو مجھے ادا کرنا چاہئے تھا۔ کہ آپ نے میری التجا کو نوازا۔ اور ہوا مجھے  
اپنا تعارف کرانا تو یاد ہی نہ رہا۔ مجھے خوشید کہتے ہیں۔ اور پریم نگر کے قریب ہی  
میری زمینداری ہے۔

”میرا نام نجم ہے۔ اور میں ریلے برادرز کا نمایندہ ہوں۔ کاروبار کے سلسلے  
میں پریم نگر جا رہا ہوں“

جب ہمارا تعارف ہو گیا۔ تو ہم ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ اور چند ہی  
گھنٹوں میں ہم گہرے دوست بن گئے جیسے برسوں کی دوستی ہو۔

سورج دن بھر کی مسافت سے تھک کر آرام کرنے کے لئے لیلانڈ شہر کے  
قصر سیاہ کی جانب تیزی سے بڑھا جا رہا تھا۔ پرندوں کے پرے کے پرے  
ابن کی بھک بھک سے ڈر کر پھر سے اڑ جاتے تھے جفاکش کسان ہل کا ندھو  
پر ڈالے بیلوں کو ہانکتے غوروں کی جانب لوٹ رہے تھے۔

گاڑی پریم نگر کے اسٹیشن پر ٹھہری۔ جیچوٹا سا قصبائی اسٹیشن تھا یہاں چند ایک سفر  
ہی اترے۔ گاڑی قریباً دو تین منٹ ٹھہری اور پھر فرارے بھرتی ہوئی نظروں

سے اوجھل ہو گئی۔

خوشید کا ناگہ ریلوے اسٹیشن کے باہر کھڑا تھا ہم اس میں سوار ہو کر کوٹھی کی جانب روانہ ہوئے۔ یہ کوٹھی اگرچہ قدیم طرز کی بنی ہوئی تھی لیکن نہایت ہی عالی شان اور فراخ تھی۔ چھانک سے برآمدہ تک ٹرک تھی۔ اس کے دور دیہ برگد کے بڑے بڑے بلند اور ہیبت ناک درخت تھے۔ کوٹھی کے عقب میں ایک خوبصورت باغ تھا مجھے ڈرائینگ روم میں بٹھا کر اور محذرت کر کے خوشید کہیں چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک نوکر چلائے لیکر آیا جب میں چائے پی رہا تھا۔ تو اس دوران میں میری نگاہیں منٹل میں لگی ہوئی تصویر پر پڑی۔ یہ ایک خوبصورت لڑکی کی تصویر تھی۔ لڑکی کیا تھی جنت کی حور تھی۔ اس کے بال سیاہ اور لمبے تھے۔ موسم پر رنگال کی راتوں کی طرح آنکھیں بادام کی سی اور چہرہ خود رو بھول سے زیادہ حسین۔ دلاؤیز۔ اور سحر انگیز۔

نہ جانے میرے دل میں یہ خیال کیوں جھپٹن تک جاگزیں ہو گیا کہ اس تصویر کا اس نوجوان کی زندگی سے کوئی گہرا روحانی تعلق ہو۔ لیکن کیا اس رومان کا حال بھی اندوہناک تھا۔

شام کے کھانے کے بعد میں نے باتوں ہی باتوں میں تصویر کے متعلق تذکرہ

چھیڑ دیا

”آپ کا خیال درست ہے لیکن سلسلہ داستان کی ایک کڑی ہے۔ میری

داستان تو بہت طویل ہے۔

”طویل!“ اور جب میں نے اُسے اپنا طویل افسانہ غم سنانے پر مجبور کیا، تو وہ

یوں گویا ہوا۔

”آپ مجھے دو نوکرہوں کے ساتھ اسقدر عالی شان اور فراخ کوٹھی میں ہائش پذیر دیکھ کر حیران ہوئے ہوں گے لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ میں ایسا کرنے پر مجبور ہوں لوگ مجھے شری اور دیوانہ کہتے ہیں ہیں لوگوں سے بہت کم ملتا ہوں۔ میرا باپ ہاشم خاں علاقہ بھر میں سب سے زیادہ دولت مند اور بارہ سوخ زمیندار تھا۔ اُس ایسا ہمدرد شخص اور دگر د کے علاقہ میں کوئی نہ تھا۔ اور یہی اس کی ہر دلعزیزی کا راز تھا۔ لیکن خانگی معاملات میں وہ جشی اور تند خو تھا۔ بالآخر اُسے دن کے جھگڑے میری ماں کی موت کا باعث ہوئے لیکن بحیثیت ایک باپ کے وہ مجھ سے نفور تھا۔ لیکن جائداد کے وارث کی حیثیت سے اُس کا سلوک مجھ سے مریبانہ تھا۔ اسے جائداد کے لئے ایک وارث کی ضرورت تھی۔ کیونکہ جائداد ہمارے خاندان میں کئی پشتوں سے بطور ورثہ چلی آتی ہے۔

(پہلا حادثہ)

اس گھر میں پہلا اور المناک حادثہ میری ماں کی پراسرار موت ہے۔ ایک دن جب وہ حسب معمول اپنے کمرے سے باہر نہ آئی تو ملازمہ نے جا کر اسکی وجہ دریافت کرنی چاہی۔ اس کی حیرانی کی کوئی حد نہ رہی جب کہ اُسے مالکہ کو بستر میں مردہ پایا۔ ڈاکٹروں نے میری والدہ کی موت کو حرکت قلب بند ہو جانے پھول کیا۔

### (دوسرا حادثہ)

ہمارے وفادار نکر جہاں کی موت نے ارد گرد کے لوگوں کو بھی تشویش میں ڈال دیا۔ اس کی موت پر طرح طرح کی چیمگیوں بھی ہوئی تھیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک دن پائیں باغ میں آم کی شاخ کے ساتھ اسکا مردہ جسم لٹک رہا تھا۔  
خودکشی!

لیکن اسے کیا ذہنی یا مالی کوفت تھی جس نے اسے خودکشی کرنے پر مجبور کر دیا؟  
یہ ایک راز ہے اور اب تک راز ہے۔

### (تیسرا حادثہ)

خودکشی بپا کی موت تھی۔ اس نے بھی خودکشی کر لی۔ اسی آم کی اسی شاخ کے ساتھ شام کی وقت وہ بھی مردہ لٹکتا ہوا پایا گیا۔ اس دفعہ پولیس نے بڑی محنت کے ساتھ تحقیقات کی لیکن خودکشی کی وجہ معلوم نہ ہو سکی لیکن اس ضمن میں مجھے ”نگس“ کا تذکرہ بھی کرنا ہے منٹل پس میں لگی ہوئی تصویر ”نگس“ کی ہے۔ ہاں تو مصیبت کے ان ایام میں اگر میرا کوئی بہرہ دار بھی خواہ تھا تو وہ صرف یہی سہتی تھی۔ اور یہ مجھ سے منسوب تھی۔  
”اور اب“ میں نے پوچھا۔

”میں نے اس رشتہ کو ختم کر دیا۔“ خورشید نے جواب دیا۔

”وجہ —“

”دیوانگی —“

”لیکن مجھے تو تم میں دیوانگی کا ایک شائبہ بھی دکھائی نہیں دیتا۔“

”دوست گرد و نواح کے تمام لوگ مجھے پاگل سمجھتے ہیں۔

”تم سیر و سیاحت سے اپنے دل کو کیوں نہیں بہلاتے۔“

”مجبوری —“

”کیسی —؟“

”مجھے وصیت کی رو سے تمام سال یہاں ہی رہنا پڑتا ہے۔“

”تم دیوانے نہیں ہو — اس وہم اور سہم خیال کو دل سے نکال دو۔“

رات تیرہ و تار تھی۔ سامنے کے کمیت خوفناک تاریکی میں ڈوب کر رہ گئے تھے۔ درختوں کی شاخوں کے جھومنے سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے دیوار اذ و در زور سے سانس لے رہے ہوں۔

میری خوابگاہ میں لمپ روشن تھا جس کی روشنی دروازہ کے شیشوں سے چھن چھن کر باہر جا رہی تھی

میں نے خوابگاہ کے دروازوں کو اچھی طرح بند کر دیا۔ اور لمپ کو بجھا کر بستر میں دراز ہو گیا۔ اور تھوڑی دیر بعد سو گیا۔

خدا کی پناہ؟

اُسی رات کے قریب مجھے کمرہ میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کمرہ کا جائزہ لیا لیکن کوئی شخص دکھائی نہ دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک پیکر میری طرف بڑھا آ رہا تھا۔ میں نے آنکھیں بند

کر لیں یقین کیجئے گا۔ اس کے سانس کی آواز میرے کانوں میں ایسے آ رہی تھی جیسے وہ میرے چہرے پر چھبکا ہو۔ دوسرے لمحے مجھے جھجور جھجور کر بیدار کر رہا تھا۔ اور کہہ رہا تھا —

”آم کے درخت کے ساتھ لاش لٹک رہی ہے۔ لاش لٹک رہی ہے۔“  
میرا خون بُنجد ہو رہا تھا۔ اس کے بعد میں کسی جذبہ کے تحت باغ میں گیا۔  
واقعی آم کے درخت سے ایک لاش لٹک رہی تھی۔ زرد۔ گردن اکڑی ہوئی۔  
آنکھیں باہر کی جانب نکلی ہوئی۔ توبہ۔ کس قدر درد خراش منظر تھا۔ قہقہہ کی آواز فضا میں گونجی۔ وہی سپیکر مجھے کمرہ میں چھوڑ گیا۔

---

دن کافی چڑھ چکا تھا کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھٹکھٹایا۔  
”آپ تو خوب سوئے“ غور شنید نے کہا۔  
”سو ناکیا ہے“ اور میں نے تمام واقعہ من و عن اس سے بیان کر دیا۔ اس کے چہرے پر مسرت سی دیکھ لگی۔  
”بختم کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟“

”مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت۔“ میں نے ذرا تلخ لہجہ میں کہا۔  
”اب میں پاگل نہیں۔ بخدا اب میں پاگل نہیں۔“  
میرے خواب درست تھے۔ باطل درست۔  
اب میں دیوانہ نہیں۔ ہرگز نہ ہرگز نہیں۔ اور نرگس میری ہے۔

---

## راز محبت

میں جوں ہی نجم کے کمرے میں داخل ہوا وہ رو رہا تھا۔  
میں یہ دیکھ کر مضطرب سا ہو گیا۔

”تم رو کیوں رہے ہو نجم“  
”جس کی قسمت میں ہی رونا لکھا ہو۔ وہ رویا ہی کرتے ہیں۔ جن کی زندگی ہی  
آنسوؤں سے بنی ہو۔ اُن کا رونے کے سوا اور کام ہی کیا ہے۔“  
”چھی چھی۔ تم آج کیسی باتیں کر رہے ہو۔ پاگل تو نہیں ہو گئے۔“  
”نہیں تو۔ کیا یہ حقیقت نہیں؟“

”ہوگی۔“ میں نے بے پرواہی سے کہا۔  
”لیکن تم یہ تو بتاؤ۔ تمہیں کیا تکلیف پہنچی۔ جو تم نے بچوں کی طرح.....“  
”نہیں دوست کچھ بھی۔“ نجم نے رد مال سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ میں  
بیکل سا ہو گیا۔ نجم کو روتا دیکھ کر — یہ میرے عزیز ترین دوستوں میں سے  
کالج میں ایک بے فکر نوجوان تھا۔ یہ فارغ البال خاندان کا نو نہ سال۔ اسے کسی  
چیز کی ضرورت نہیں تھی۔ پھر اس کا اشکوں کا سیلاب بہا نا چہ سنی — جوں جوں

میں اس کے متعلق سوچتا تھا میری عقل کام نہ کرتی تھی۔  
میں نے کہا۔ اگر تم نے مجھے حقیقت حال سے آگاہ نہ کیا تو میں پھر بھی اس  
کرہ میں قدم نہ رکھوں گا۔

”وہ یہ سنکر سوچ میں پڑ گیا  
”تم۔ تم۔ اس راز کو سنکر خوش ہونے کی بجائے روؤ گے۔ افسوس کرو گے  
اور بہت ممکن ہے کہ میری حماقت پر مہنو۔“

لیکن اب جبکہ تمہیں اس کے سننے کا بڑا اشتیاق ہے۔ تو لو سنو۔“  
یہ کہہ کر اس نے جیب سے ایک لٹیری رومال نکال کر میز پر رکھ دیا۔ اس کے  
ایک کونہ پر انگریزی میں ”A“ لکھا تھا۔  
اس میں نیم سنہری بالوں کا ایک گچھا لپٹا ہوا تھا اور ایک خوبصورت  
ہیرین (Hair Pin) تھی۔

”لیکن اس کا تہارے رونے سے کیا تعلق؟“ میں نے پوچھا۔  
”میں نے تم سے کہا تھا کہ یہ المناک داستان نہ سنو۔ انہیں سے تو اندوہناک  
افسانہ وابستہ ہے۔ یہ ان کی نشانی ہے۔“

”مکن کی۔۔۔ آہ! انہی کی جن کی یاد میری زندگی ہے میں تمہیں ان کے  
نام سے آگاہ نہیں کروں گا۔“

یہ۔۔۔ میرے دل کی لک۔۔۔ میرے سندرہ پنوں کی رانی۔ میری آشاؤں  
کی دیوی نے مجھے نشانی دی تھی۔ مجھ سے رخصت ہوتے وقت..... لیکن

بخم تم نے تو کبھی بھی مجھ سے اس بارہ میں بات نہیں کی۔

وہ چونک اٹھا۔ جیسے خیالات میں کھویا ہوا انسان یکبارگی اسکا احساس کردہ کے چونک اٹھتا ہے۔ ہاں۔۔۔ تو وہ۔۔۔ میں اُن کے ہاں آیا جا یا کرتا تھا اور اکثر وہ بھی میرے غمکہ کو اپنے حُسن جہاں سوز سے منور کیا کرتے تھے۔  
میں نہیں تمام داستان نہیں سناؤں گا۔ نہیں اس کے متعلق ناراض نہیں ہونا چاہئے۔ اس میرن کی بابت بتا دوں گا۔۔۔ بخم نے کورے پن سے کہا۔

”وہ جا رہی تھیں ہمیشہ ہمیشہ کیلئے۔ میرے شہر سے۔ دل میں محبت کی۔  
دبی چنگاری بھڑک اُٹھی۔ تمام وہ باتیں جو ہمیں پنہاں تھیں۔ دل چاہتا تھا۔ ان سے کہہ دوں۔ آرزو میں چل گئیں۔ پیامِ محبت ان تک پہنچانے کے لئے لبِ بیتاب ہو رہے تھے لیکن مجھے حوصلہ نہ پڑتا تھا۔ وہ اور میں آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ خاموش۔ دونوں خیالات میں کھوئے ہوئے۔ میز پر ایک رسالہ پڑا ہوا تھا  
میں نے اس شعر پر نشان لگا دیا۔

ہمارے عشق کا معیار کوئی کیا سمجھے

خدا کی بات کو سمجھے تو خدا سمجھے

اور پھر بغیر کسی کام کے کمرے سے باہر آگیا۔ میں نے دیکھا۔ اُنہوں نے وہ شعر پڑھا اور ٹھنڈی سانس لی۔ اور نہ جانے کس خیال میں سینکڑوں دفعہ اس شعر کو گنگنا یا کئے۔۔۔

اور جب میں دوبارہ آکر ان کے پاس بیٹھا تو انھوں نے پوچھا۔  
”اس شعر پر آپ نے نشان لگایا تھا؟“

”جی —“ میں نے دھیمے سے کہا۔ ”یہ غلطی مجھ سے ہی سرزد ہوئی۔“  
لیکن خدا معلوم مجھ میں قوت گویائی اس وقت کہاں سے آگئی۔ میں اس راز کو  
جو میں اپنے دل میں پانچ سال سے چھپائے پھرتا تھا، اسکا انہار کر دیا۔ مجھے امید تھی۔  
میری محبت ٹھکرائی جائے گی لیکن نہیں۔ نہیں۔

انھوں نے میری درو بھری کہانی کو سنا۔ بڑے اطمینان اور سکون کیساتھ۔  
بعض دفعہ وہ مسکرا بھی دیتے تھے۔ اور میں جھینپ بھی جاتا تھا۔ مجھے ان کے الفاظ  
ابھی طرح یاد ہیں۔

”نغم — میں تمہاری ہوں — میرے اچھے نغم۔“

## نیل سارھی والی

سچ پوچھئے تو کالج بھی ایک قسم کی تفریح گاہ ہے۔ ممکن ہے میرا نظریہ دیگر اشخاص سے مختلف ہو۔ یہاں نہ تو فکر معاش ہوتا ہے اور نہ ہی اسکول کی طرح ماسٹروں کی جھڑکیاں سہنی پڑتی ہیں۔ ہر کالج میں خلیفہ ضرور ہوتا ہے۔ اور پھر خلیفہ کے چیلے چاہئے بھی۔ جو خوش فعلیاں اور من مانی کارروائیاں بھی کرتے ہیں۔

یہ ۱۹۳۲ء کا ذکر ہے۔ ہمارے ساتھ تھرڈ ایر میں ایک طالب علم ”قادر“ داخل ہوا۔ یہ حضرت مولویانہ وضع قطع رکھتے تھے۔ خشخاشی ڈاڑھی۔ بند گلے کا ڈھیلا ڈھالا کوٹ۔ ٹخنوں سے اونچی شلوار۔ پاؤں میں زرمی کی جوتی۔ سر پر ترکی ٹوپی۔ گویا بالکل الموزے تھے۔ اور کسی جگہ تو شاید سادہ دل اور مولوی نما اشخاص کی مٹی پیدا نہ ہو لیکن کالج کے بنگلوں سے وہ نجات نہیں پاسکتے۔ ان کی اس ہیئت کذائی کو دیکھ کر بھلا ان میں کہاں تاب کہ آئے ہوئے شرکار کو ہاتھ سے چھوڑ دیں۔

”قادر“ کو بنانے کے لئے بڑی بڑی تجویزیں پیش ہوتیں لیکن ناقابل عمل سمجھ کر رد کر دی جاتیں۔ سب سے بڑی قباحت یہ تھی کہ وہ ہم سے پرے پرے رہتے تھے۔ ہم میں شمار بڑے ہوشیار تھے۔ وہ خلیفہ تو تھے لیکن جانشین نہ کہے جاسکتے تھے۔

ایک دن یاروں نے کہا: "چھوٹے خلیفہ۔ اگر تم نے مولوی کو نہ پھانسا تو ہم تمہیں کاٹھ کا اُٹوہی سمجھیں گے۔" یونسکر نثار صاحب بولے: "یہ منظر تو ایک ہی جھانسنے میں۔" دوسرے دن ہماری حیرانی کی کوئی حد نہ تھی جب ہم نے نہایت گہرے دستوں کی طرح نثار اور مولانا کو باتیں کرتے دیکھا۔

نثار نے مجھے اشارے سے بلایا میں بھی اُن سے ذرا دُور جا کر کھڑا ہو گیا۔ مولوی صاحب (قادر) اور نثار مذہبی گفتگو کر رہے تھے۔ اس کے بعد پھر تو یہ ہوا کہ یہ حضرت پہرہوں تک ہوسٹل میں ہمارے پاس بیٹھے گئیں ہانکتے رہتے۔ مولوی صاحب نے اگرچہ اپنے مخصوص فیشن کو ترک تو نہیں کیا تھا لیکن معلوم ہوتا تھا کہ اب وہ ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہیں گے۔ باتوں باتوں میں ہمیں معلوم ہو گیا کہ آپ خیر سے اس دنیا میں ہی بقول حفیظ جالندھری

زادہ دنیا ہی میں سیکھ حور سے ملنے کے ڈھنگ  
ورنہ پچھتاؤ گا کہ جنت میں بھی رِوانی ہوئی  
کافرا۔ تو بے گن جینوں سے یہ ڈھنگ سیکھنا چاہتے تھے۔

مارچ کا مہینہ تھا۔ آخری ایام تھے۔

موسم بہاں کی آمد آمد تھی۔ ہوا میں کرنے کے پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ پہلی ہوئی رات تھی۔ لائسنس کے چمنستان میں اُردی اُردی۔ نیلی نیلی۔ گلابی اور دھانی ساڑھیوں والی تیریاں محو خرام تھیں۔ طوفانِ حُسن میں الفت کے سیپنے

ہچکولے کھارہے تھے۔ ہماری فروج بھی بہت مولوی صاحب خلیفہ کی سمیت میں مد باز میں مصروف تھی۔

اتفاقاً مولوی صاحب کے پاس سے ایک نیلی ساڑھی والی "حسینہ کا گزر ہوئی" کا سا شگفتہ رنگ، ٹوٹا سا قد، غزالیں آنکھیں، اور نازک نازک ہونٹوں پر رقصاں تہنم

بس مولوی صاحب تو اسکو دیکھ کر ریشہ ختمی ہی ہو گئے اور لگے سبحان اللہ سبحان اللہ کرنے یار لوگوں کو ایسا موقع خدا سے جس لمحہ کی انتظار تھی وہ قدرت نے خود ہی ہتیا کر دیا۔ اسی رات تمام اجاب کی مجلس شوریٰ منعقد ہوئی۔ اور ان حضرات کو آٹو بنانے کا پروگرام مرتب کیا گیا۔ اس واقعہ سے تیسرے دن آنجناب کو صبح کی ڈاک سے ایک لفافہ خوشبو میں بٹا ہوا موصول ہوا۔ مولوی صاحب نے بیقرار دل کیساتھ کھولا۔ پڑھا۔

"آسمانِ محبت کے درخشاں تارے۔ خدا تمہاری تابشوں میں اضافہ کرے۔ مریض سحر کا پُر محبت ہدیہ سلام قبول ہوا۔"

کل سے جو وقت سے آپ کو باغ میں دیکھا ہے، دنیا سے جذبات میں رک پھل سی پیدا ہو گئی ہے۔ محبت کی آگ دل ہی دل میں سلگ رہی ہے۔ آپ کی یاد۔ دلکش یاد ہی شب تنہا کی ظلمت انسزا خاموشیوں میں تسلی دیتی ہے۔ راحت نواز ہے صرف آپ ہی کا خیال!

کاش آپ سمجھ سکیں کہ عورت زندگی میں صرف ایک فہم ہی محبت کرتی ہے۔ آپ

کل مجھے باغ میں — کنج میں ملیں۔ دیکھئے بھولے گاہنیں۔  
 قاصد پیام شوق کو اتنا نہ دینا طول  
 اُن سے فقط یہ کہنا کہ آنکھیں ترس گئیں

صرف آپ کی  
 نیلی ساڑھی والی

مولوی صاحب کو ہم تمام نے فول بنانا شروع کیا۔ حضرت ایسے موقعے  
 زندگی میں بار بار نہیں آتے۔ ممکن ہے امیر گھر لے کی ہو میسے یار ملا مال ہو جاوے  
 سونے میں رنگ دیگی۔ ایک صاحب بولے: کیوں بھی نثار۔ تمہارا کیا خیال ہے بخدا  
 مجھے ایسا موقع ملے تو کبھی نہ چھوڑوں۔

نثار نے کہا: ”مولوی صاحب۔ معلوم ہوتا ہے۔ آپ ماہر عملیات ہیں۔ کیوں  
 مولانا۔ کوئی حُب یوسفی تو نہیں پڑھ کر پھونک دیا۔ وَاَللّٰہ (واللہ) آپ تو بھسنی چھپے  
 رسم نکلتے۔“

مولوی صاحب بڑے تذبذب میں تھے۔ اُس وقت تو کچھ نہ بولے لیکن نثار کو اتنا کہ  
 دیا کہ ذرا انگلش کے پیر پڑ کے بعد کہیں کھسک دجانا مجھے تم سے ذرا — ہاں  
 بس سمجھ گئے نام۔“

یار لوگوں نے نعرہ لگایا۔ تیر نشانے پر بیٹھا تھا۔  
 نثار نے مولانا کو وہاں جانے پر راضی کر ہی لیا۔ لیکن تجویز یہ مٹھری کہ مولانا  
 وہاں اکیلے جائیں۔ اور مولویا نہ لباس نہ پہنیں۔ بلکہ کوٹ پینٹ

پہنکر بالکل نیو صاحب بنیں کہیں ایسا نہ ہو۔ پھنسا ہوا سکارا تھکے سے گل جائے۔ اس مقصد کے لئے کالج کے ایک لارڈ (Lord) کا بہترین سوٹ مستعار لینا پڑا۔ مولانا بھی ڈاڑھی مونچھے صفا چٹ۔ چھنبکے کے قریب ہوٹل میں تشریف لے آئے۔

اب ان کا میک اپ شروع ہو گیا۔ نثار صاحب — سوٹ کے ساتھ ٹانی کارنگ (match) کر رہے تھے۔ ایک اور صاحب (Kishore) لگا رہے تھے۔ غرضیکہ اس انہماک اور شان سے (make up) ہو رہا تھا کہ شاید کبھی ہالی وڈ کی کسی گلیمر گرل (Glamour) کا بھی نہ ہوتا ہوگا۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد مولانا سترپا انگریزی لباس میں نظر آ رہے تھے۔ مولانا نے آئینہ میں جو اپنا چہرہ دیکھا تو حیران رہ گئے۔ انہیں اپنے آپ پر حوکہ ہو رہا تھا۔

یار لوگوں نے مولانا کے وجہ ہونے میں زمین آسمان کے قلابے بلا دیئے۔ ادھر مولانا کا (make up) ہو رہا تھا۔ ادھر ساتھ والے کمرے میں سریندر کو ایک بھر ٹکیلا بلاؤز اور نیلی ساڑھی پہن کر بالکل پری چہرہ نسیم بنا دیا گیا تھا۔ مولوی صاحب کے ہوٹل جانے سے پہلے نثار اور سریندر مع دیگر احباب کے کچ میں جا بیٹھے تھے۔ اب صرف ان حضرات کا انتظار تھا۔ بارے خدا خدا کر کے مولانا جھوٹے جھامٹے آئے۔ ان کو ادھر آتا دیکھ کر نثار وغیرہ تو کھسک آئے۔ اور سریندر کو کہیدیا کہ بچہ خیال رہے۔ مولانا کو وہ بے بھاؤ کی پڑیں کہ بس سہل اور ان کی چسپاں

کوئی فرق نہ رہے۔

”آپ کے انتظار نے تو مجھے بالکل ہی سبیل بنا دیا تھا شکر ہے کہ آپ تشریف لے آئے۔“ سریندر نے نازک سی نسوانی آوازیں کہا۔

”لو آپ کی پیاری پیاری تحریر پہنچتی اور میں نہ پہنچتا۔ یہ کیسے ممکن تھا“ اور مولوی صاحب نے وہ تمام محبت بھرے فقرات جو انھوں نے اس موقع کے لئے زبانی یاد کر رکھے تھے دہرانے شروع کر دیئے

”میرے من مندر کی دیوی ————— میری شمع شبستان حیات مجسمہ حسن

وغوبی۔ وغیرہ۔

اور اب ذرا حضرت کھسک کھسک کر قریب آ رہے تھے۔ اُن کا ہاتھ گردن میں حائل ہوا ہی چاہتا تھا۔ کہ جوتے کی پٹ پٹ کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ مولانا بھونچکے سے رہ گئے۔ مار سے تلملارہے تھے — جب یار لوگوں نے دیکھا کہ ان کی خوب تواضع ہو گئی۔ تو لگے ایک ایک کر کے آداب عرض کرنے۔ سریندر نے ساڑھی اتار کر پر سے پھینک دی۔

مولانا کے منہ سے غصہ کی وجہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔ اور وہ وہ ملاجیاں

سُنا رہے تھے کہ الامان۔

بڑی مشکل سے ان حضرت کو چپ کرایا۔

اور پھر آہستہ سے ایک لڑکا بولا۔ ”حضرت راج تو یکم اپریل ہے۔ اور آپ

ناحق خانا ہو رہے ہیں“

یار لوگوں نے قہقہہ لگایا

دوسرے دن یہ حادثہ کالج میں سب کی زبان پر تھا۔

اس واقعہ کے بعد مولانا کو پھر کالج میں نہیں دیکھا۔ شاید کسی اور کالج

میں داخل ہو گئے ہوں۔

# نامہ ہائے درد

(یہ خطوط کیا ہیں۔ ایک دکھی دل کی مچا۔ یہ نوحہ ان مسرتوں کا ہے جو بیت چکی ہیں۔ ایک چنگاری ہے جو شعلہ جوالا بن چکی ہے)

جاں نواز :-

تمہارا راحت سے بھر پور خط ملا۔ میرے لئے تمہاری مسرتیں اطمینان اور سکون کا باعث ہیں۔ کچھ دن اور انتظار کروں گا لیکن کب تک۔  
 سہ سبھا ہوا ہوں شومی دست دعا کو میں  
 کچھ روز اور دیکھ رہا ہوں خدا کو میں

کچھ دنوں سے جذبات کے سمندر میں طوفان کا زور کم ہو گیا تھا۔ لیکن، اب پھر ہیجان پیدا ہو گیا ہے۔ سمندر طوفان اٹھنے سے پہلے پُر سکون ہوتا ہے۔ ایسے ہی میرے دل کی حالت تھی۔ اس میں جذبات کے تلاطم سے پیشتر اک سکون پیدا ہو گیا تھا۔ میری دنیا میں مسرت اور شادمانی کا کیا کام؟

تمہارا  
خستہ

## راحت نواز بہ

میں نے تم سے سو بار التجا کی ہے۔ میرے خط کے لئے بیتاب نہ  
ہوا کرو۔ ماحول کے اثر سے محفوظ نہ رہ سکے۔ دل بیکراہی رہتا ہو،  
”چین کا لٹہ بھی نصیب نہیں ہوتا۔ بھولے دوست تم نے دل کے نائٹو  
کو چھیڑ دیا راحت بھرے لمحے کی یاد۔ ایک چرکہ ہے دل حنین  
کے لئے۔ کون۔ کسی کا۔ میں مسکرا رہا ہوں۔ تم ابھی  
تنگ شکار ہو فریب دوستی کے۔

جسے میں اپنا سمجھوں۔ وہ میرا نہیں۔ اور جسے تم اپنا سمجھو۔ وہ تمہارا  
نہیں حقیقت تو یہ ہے کوئی بھی کسی کا نہیں۔ کون کسی کا؟  
شاید تمہارا نظریہ درست ہو محبت اک کیفیت ہے۔ اسکے بغیر زندگی اجیرن  
ہے۔ بہر حال مجھے تمہاری سادہ لوحی عزیز ہے۔ الوداع۔

تمہارا  
اختر

## روح نواز

سب کچھ جانتے ہوئے بھی اسجان بننے کی کوشش کر رہے ہو۔ مجھ سے  
پوچھتے ہو۔ بیکرا کیوں؟ مجھے شکوہ نہیں تمہاری ستریں مبارک  
مجھے دکھا۔ درد بیکرا کی

تم کو اصرار ہے میں گیت کیوں نہیں لکھتا۔ بربط کا وہ تار ٹوٹ چکا  
جس سے دلکش نغمات پیدا ہوتے تھے۔ اب اگر اس میں ارتعاش بھی  
پیدا کیا گیا۔ تو حزن و ملال سے بھر پور نغمہ نکلیگا جسے سُکر تم افسردہ ہو  
جاؤ گے۔

میں نہیں آسکوں گا۔  
تمہارا  
اختر

ظالم  
رونے بھی نہیں دیتے سُکھتی آگ کو شاید آنسو ہی سبجاسکیں۔ تم  
چاہتے ہو کہ یہ چنگاریاں شعلہ جوالہ بن جائیں۔ اور پھر اس آگ سے  
اک دنیا خاکستر ہو جائے۔

مجھے رونے سے منع نہ کرو۔ اگر آنسو جگر کا خون ہو کر نہ بہے۔ تو پھر  
اک حشر بپا ہو جائیگا۔ دل کی دنیا میں کبھی کبھی اک دبی ہوئی چنگاری  
ہی ارد گرد کی ہر چیز کو جلا کر بھسم کر دیتی ہے۔

تمہارا اختر

پر دسی :-  
مجھے دنیا کی پرواہ نہیں۔ میں اس کی پرواہ بھی کیوں کروں؟ زندگی

مجھے زندگی سے موت زیادہ عزیز ہے۔ میں زندہ اس لئے ہوں  
کہ زندہ رہنے پر مجبور کیا جاتا ہوں۔ چراغ سحری کی طرح ٹٹھا رہا  
ہوں۔ اجل کا ایک جھونکا سے بجھا دے گا۔ نہ جانے یہ دیمک  
کب بجھ جائے۔ ہر لمحہ انتظار ہے۔

تمہارا  
خستہ

### دوست

دُنیا سے دُور رہنے کی کوشش کرو۔ تمہارا ننھا سا دل اس کی سفاکانہ  
کشملش کی تاب نہیں لاسکیگا۔ اس دنیا میں کچھ مُسکراہٹیں بھی ہیں کچھ  
آنسو بھی۔ آلام اور راحتیں۔۔۔ لیکن آنسو زیادہ اور مُسکراہٹیں  
کم۔ آلام کی فراوانی۔ مسرتوں کی قلت۔ اکثر میں پہروں تکسہ ہی  
سوچتا رہتا ہوں۔ زندگی کیا ہے؟ اس کا مقصد زندگی اک بحرِ بکراں  
ہے۔ شاید۔ اور اس میں لاتعداد لہریں ہیں غم اور مسرت کی۔ اس  
دنیا اور دنیا والوں کو دیکھ کر الجھنوں سے معمور ہو جاتا ہے۔

موت زندگی سے بدتر جہا بہتر۔

موت صبحِ مسرت ہے۔ پُر شکوہ۔

کلفت و آلام سے نجات دلانے والی۔ تم ذرا سوچو۔ جس کو طمانیت

قلب ہی حاصل نہیں وہ کبھی شاد ہو سکتا ہے۔ پر درد دگر !  
تیرے راز سمجھنے سے انسان قاصر ہے !  
تمہارا اختر

”میں ماضی؟ سو گوار ہوں“  
یہی لکھا ہے تم نے۔۔۔ نادان تم ماضی کا تذکرہ کر رہے ہو میں  
مستقبل کو بھی روچکا۔ پھر آنسو کیوں بہائے جائیں۔  
اس زندگی اور اس کی جھوٹی خوشیوں کے لئے۔ جو کچھ بھی نہیں  
محض ایک رنگین دھوکا۔

پھر میں گے — تمہارا  
اختر

اتنے قریب ہو کر بھی مجھے نہ سمجھ سکے۔ تمہارے نزدیک زندگی کا  
مقصد ہے — م — ح — ب — ت — لیکن  
خدا کے لئے محبت کے متعلق میرا نظریہ دریافت نہ کرو —  
عشاق کی دنیا میں پھل بپا ہو جائے گی۔  
دل کی دنیا کو آباد کرنا چاہتے ہو۔ مگر کھ ہو — جانتے نہیں  
اس دنیا میں کیا ہے۔ آنسو ہی۔ آنسو۔ تمہارا اختر

دوست :-

تمہارا خیال سو فیصدی درست ہے۔ چشمہ پیاسے کے پاس  
آئے اور پیاسا پھر بھی پیاسا ہی رہے — تو اس میں  
چشمے کا کیا قصور تمہاری قسمت میں پیاسا ہی رہنا ہوگا  
ترپ رہے ہو۔ بیکل ہو رہے ہو۔ کبخت دل کو جی بھر کے  
ترپنے دو۔ بقرار ہونے دو۔ تم نے دیکھا ہوگا۔ ننھا بچہ جب  
کسی چیز کے لئے ضد کرتا ہے۔ تو چیز نہ ملنے پر مچلنے لگتا ہے۔ پھر  
روتا ہے۔ اس کے بعد جانتے ہو کیا ہوتا ہے ؟ روتے روتے  
نڈھال ہو جاتا ہے۔ پھر وہ روتا ہی نہیں۔ کیونکہ رو ہی نہیں سکتا۔  
اپنے دل کو بھی رونے دو۔ بقرار ہونے دو۔ ترپنے دو۔ اس کے  
بعد ایک سکون حاصل ہوگا۔ پائیدار تمہارا اختر

مخلص دوست !

تمہارا خط کل ہی ملا ہے۔

کیا کہا تم نے۔ میرے خط نے تمہاری پریشانیوں میں اور بھی اضافہ  
کر دیا۔ اس دنیا میں صرف پریشانیاں اور پریشانیاں ہی تو ہیں

تمہارا اختر

مجھے تنہا رہنے دو۔ سچ کہتا ہوں — پیارا اب اس حد تک پہنچ چکا ہے۔ جہاں دوا اور دوا دونوں بیکار ہیں۔  
 تمہاری کوششیں کارگر نہیں ہو سکتیں۔ اگر مجھ سے یہ درد چھین لیا جائے تو میری زندگی میں کیا رہ جائے گا۔ ع  
 اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے  
 تم میرے سرمایہ حیات پر ڈاکہ زنی کرنا چاہتے ہو۔ بخدا میں جیتے جی اپنے متاع زندگی کی پوری پوری نگہداشت کروں گا۔ رخصت!  
 تمہارا اختر

دلنواز — کیا کہا؟

میرا دماغی توازن بگڑتا جا رہا ہے۔ ٹھیک ہے۔  
 لیکن یہ دیوانہ اپنے متاع زندگی کو ٹوٹنے کی اجازت نہیں دے سکتا صحن گلشن کی سیر کرنے والا اگر پھولوں کی دید سے حظ اٹھانا چاہے تو باغبان کو کوئی تعرض نہیں ہوتا۔ لیکن اگر وہ انھیں نوچنے لگے تو وہ تھلا اٹھتا ہے۔ اگر تم سیر کرنے کی خاطر آؤ۔ تو چشم مارو شن دل ماشاؤ! لیکن اگر تم اضطراب و انتشار کی ننھی ننھی کلیاں نوچنا چاہتے ہو تو میں اسکی اجازت نہیں دوں گا۔  
 ہاں! میرا دماغی توازن بگڑتا جا رہا ہے۔  
 ”دیوانہ اختر“

پڑانے حربے استعمال کرنے لگے۔ یہ ہتھیار تو زنگ آلود ہو چکے  
 آدم کے خلد سے نکلنے کے بعد ہی سے ان کا استعمال شروع ہو گیا  
 تھا۔ اب تو یہ کُند اور ناکارہ ہو چکے ہیں۔  
 نئے ڈھنگ نئے انداز اختیار کرو۔ مجھے دوزخ سے ڈرانا چاہتے ہو  
 کیا انسان کے لئے یہ تمہاری وسیع دنیا دوزخ سے کم ہے۔ مجھے  
 ان خوش نصیب انسانوں کی فہرست تو بھیج دو۔ جو تمہارے خیال  
 میں بہشت کے حقدار ہیں۔

”دیوانہ - اختر“

روح نواز !

میں قدرت سے انتقام لے رہا ہوں۔ وہ مجھے نیست و نابود کرنا  
 چاہتی ہے۔ میں اس کا مسخرہ اڑاتا ہوں۔ وہ محبوب ہو جاتی ہے۔

”دیوانہ اختر“

# انارکلی

انارکلی میں دُخس ہوتے ہی اسکا پہلا خیال یہ تھا کہ یہاں زندگی ہی زندگی ہے۔ اُسکا دوسرا خیال یہ تھا کہ یہاں ایک دنیا ہے رومان آباد ہے۔

اُسے نیلا کوٹ پہنا ہوا تھا جسکا رنگ کثرت استعمال کی وجہ سے بھوسلا ہو گیا تھا۔ اور جگہ جگہ سے پھٹ کر اپنی کہنگی کا اعلان کر رہا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں ڈالے ہوئے تھے —

اس کے پاس سے دو حسین و جمیل لڑکیاں ساریوں میں ملبوس گذریں۔ ان کی سمیں کلائیوں میں ملکی بھلکی کالج کی چوڑیاں تھیں۔ ہونٹ پیٹے اور اسقدر سُرخ تھے کہ لالے کی سرخ اور نازک پتیوں کا دھوکا ہوتا تھا۔ راگبیر للچائی ہوئی نظروں سے ان کو دیکھ رہے تھے۔ ان میں وہ بھی شامل تھا۔ اس کی نظریں بھی تمام چیزوں سے ہٹ کر صرف ان لڑکیوں کی طرف مرکوز تھیں۔ تھوڑی دُور جانے کے بعد ایک دوکان کے باہر اس نے ایک عورت کا پلاسٹر کا مجسمہ دیکھا۔ دوکان والوں نے مشہوری کے لئے اُسے ایک ساڑھی پہنائی ہوئی تھی نہیں بلکہ نہایت بھدے طریقے سے لپیٹی ہوئی تھی۔

شیریں فریب — وہ بڑبڑایا۔ مگر اہلیت کبھی پوشیدہ رہ سکتی ہے ؟

اور اس نے حقارت سے منہ دوسری جانب پھیر لیا۔

ایک دم اس کی نظریں ایک لڑکی سے دوچار ہوئیں جو سامنے کی دوکان سے کچھ خریدنے میں مشغول تھی۔ وہ اُسے ایک دو تین منٹ تک ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک بنڈل ہاتھ میں لئے چل دی۔ اس کی نگاہیں اس وقت تک تعاقب کرتی رہیں جب تک کہ وہ نظروں سے اوجھل نہ ہوئی۔

تھوڑی دیر کے بعد ننھی سی گلابی رنگ کی بے بی اسٹن کار اس کے قریب آکر ٹھہری۔ اس میں ایک خوبصورت لڑکی انارکلی کی ہنگامہ پر درفضا میں سوٹر بننے میں مشغول تھی۔ وہ حیران تھا کہ ”انارکلی“ جہاں قدم قدم پر فتنے پیدا ہوتے ہیں۔ جہاں کیف و نشاط کا دور دورہ ہے۔ وہاں یہ لڑکی خاموش سویر بیٹھنے میں بہت تن محو ہے۔ جیسے وہ ان تمام چیزوں سے بے نیاز ہے۔ یہ سورش و ہنگامہ کیف و نشاط، یہ فتنے۔ اس کے لئے سکوت و سکون سے بڑھ کر ہیں۔ اس نے ہستہ سے کہا۔

”جوانی — — — حُسن — — — دولت یکجا ہیں۔

اُس نے لڑکی کی طرف دیکھنا چاہا۔ مگر وہ جھجکا کہ کوئی اُسے دیکھ نہ رہا ہو۔ اور دوسرے لمحے وہ اسے دزدیدہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ وہاں سے چل دیا۔ ایک بہت بڑی دوکان سے ایک خوش پوش مرد اور ایک جوان

عورت جو جوانی کی مہکتی ہوئی رات میں موجودہ تہذیب و تمدن کے نیم عریاں لباس میں مزین تھی مسکراتے ہوئے باہر آ رہے تھے۔ اسکان دونوں کی ہنسی ایسے معلوم ہوتی تھی جیسے وہ اسے کہہ رہے ہوں

”بیوقوف! تم ایسے نفسِ شمس کو انارکلی میں پھرنے کی اجازت نہیں۔“

اُسے اپنے آپ پر ایک نظر ڈالی۔ اوہو! میں نے تو کبھی اپنے بوٹ بھی پالش تک نہیں کئے اس احساس سے ذہنی طور پر سجد اذیت ہو رہی تھی۔ وہ مضطر سا ہو گیا۔ امارت کے جوتھوش اس نے دیکھے تھے۔ وہ ان کے خیالوں میں مستغرق تھا کہ ایک دم کوئی چیز زور سے اس کی ٹانگوں سے ٹکرائی۔ یہ سائیکل تھی اور سوار۔ دیری۔ سوری کہہ کر یہ جا۔ وہ جا۔ لیکن ٹانگ میں درد ہو رہا تھا۔ پھر اس کے پاس سے شوخ و شنگ لڑکیوں کا ایک چھوٹا سا گروہ گزرا۔ وہ فضاؤں میں ہتھتے بکھیرتی ہوئی بے حجابانہ جا رہی تھیں۔ وہ مغربی تعلیم اور اس کے اثرات کو دل ہی دل میں کوس رہا تھا کہ اسے

اوباد۔ (اوبالو) — اوباد (اوبالو) کی آوازوں نے چونکا دیا۔ اور کسی نے اُسے کندھے سے پکڑ کر ایک طرف کر دیا۔ اُسکی نظروں کے سامنے گھوڑا۔ دو پہیے تھے۔ ٹانگہ میں ایک محم شمیم آدمی غیظ و غضب سے اُس کی جانب گھور گھور کر دیکھ رہا تھا۔ غم و دکھ اور ندامت کی وجہ سے اسکا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ دوسرے لمحے وہ انارکلی سے جلدی جلدی قدم اُٹھائے جا رہا تھا۔ جیسے اس فضا میں دم گھٹا جا رہا ہو۔

## بیچارہ فضلہ

اس کا صحیح نام تو خدا جانے کیا تھا۔ لیکن اسکے ساتھی اسے ”فضلہ“ ”فضلو“ کہہ کر ہیکار تے تھے۔ دہلی دروازے کے باہر باغ کے ایک جھاڑی کے گوشے میں اس کے ماں باپ نے اُسے پڑا ہوا پایا تھا۔ وہیں وہ پٹھان بھیک منگوں کے لڑکوں کے ساتھ بڑا ہوا جب چھ سات برس کا ہوا تو بھیک مانگ کر پیٹ پالنا شروع کیا باغ میں ایک درخت کی چھاؤں تلے گھاس پھوس کی ایک جھونپڑی اس کے ماں باپ کا مسکن تھا۔ وہ بھیک مانگ کر لاتے پیٹ کے دوزخ میں اس جھونپڑی سے اور زندگی کے دن گزارتے تھے۔ اُن کے مرنے کے بعد یہی درخت اسکے جیون مرن کا ساتھی تھا۔ ایک مخلص ہمدرد رفیق۔ سردیوں کی غم آلود راتیں گرمیوں کے سلگتے ہوئے دن۔ سادوں اور بھادوں کے برستے ہوئے مہینوں میں اس درخت کی مہرقت آغوش اُسے ماں باپ کی گود کا سکون، راحت عافیت عطا کرتی تھی۔

بارہا پولیس نے آوارہ گردوں میں اُس کا چالان کیا۔ لیکن رہائی کے بعد فضلہ نے پھر اسی درخت کے تلے ڈیرہ اُن جمایا۔ ایک پُرانی سی گود ڈری۔

ایک تمام چینی کی پلیٹ - تمام چینی کا ایک پیالہ - یہ اسکی کل کائنات تھی - صبح اٹھکر وہ گودڑی لپیٹ کر درخت کی شاخ پر رکھ دیتا - اور پیالہ ہاتھ میں پکڑ - پلیٹ کو بغل میں دبامانگنے کے لئے نکل جاتا - کتنے ہی سالوں سے وہ اسی طرح زندگی کے دن گزار رہا تھا -

اسے ایک عادت سی تھی جو نہی موٹر کار پاس سے گذری وہ اُسے دیکھنے کے لئے سراپا چشم بجاتا - یہ عادت جنون کی حد تک پہنچ چکی تھی - موٹریں دیکھنے کے لئے وہ ریلوے اسٹیشن پر چلا جاتا - وہاں نیلی - سیٹی - سُرخ - آسمانی رنگ کی کاریں قطار اندر قطار کھڑی ہوتیں - وہ انھیں دُور سے ایسے دیکھتا جیسے کوئی اچھوت دیوی کے درشن کر رہا ہو -

اس کے دل میں خواہش پیدا ہوتی - اے کاش! اُسے کہیں سے الہ دین کا چرائل مل جائے - پھر وہ جن کو کہے - بس مجھے کچھ نہیں چاہئے - کار ہو - بہت ہی خوبصورت کار - جس پر وہ سوار ہو - اور اُسے اُڑتا پھرے - کبھی انارکلی میں لے جائے کبھی لارنس گارڈن کی سیر کرے - مگر ایسا ہوتا نہیں تھا - یہ سوچتے ہیئے اُسے آگے بڑھ کر ایک کار کو دیکھنا چاہا - ڈرائیور نے گالیاں دیتے ہوئے زور سے ایک تھپڑ لگایا اور فضلہ بے چارہ اپنی قسمت کو کوتاہوا وہاں سے چل دیا - شام کو وہ ایک چکر انارکلی میں لگاتا - اُسے یاد تھا کہ نیلے رنگ کی سکوڈا اس جوان لڑکی کی ہے جو عمو ماگلا بی رنگ کی ساڑھی پہن کر شوپنگ کے لئے آئی ہے اور فورڈ کا سالہ ۱۹۳۲ کا موڈل سیٹھ ہرمجی مل کا ہے جو اپنے آنے کا

یون میل ہی سے اعلان کرتا آتا ہے جس کے مڈگارڈوں پر اُس کی گڈڑی سے زیادہ لوہے کے پیوند لگے ہوئے ہیں۔ بازار کے ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے تک وہ کاریں دیکھتا جاتا۔

گرمی کا موسم بیت چکا تھا۔ رات کو فضلہ نے خوب پیٹ بھر کر پلاؤ کھایا تھا۔ شہر کے ایک مالدار کی بیوی کا چہلم تھا۔ اور اُس نے ایصالِ ثواب کے لئے دہلی دروازہ کے باغ کے کینوں کو دعوت پلاؤ دی تھی جسٹو۔ میرو۔ رنجو۔ نظر و کے ساتھ فضلہ نے بھی خوب پیٹ بھر کر چاول کھائے تھے۔ اور زیادہ ثواب دلایا تھا۔ نو بجے کے قریب اُس کی آنکھ کھلی۔ ارد گردِ نظر دوڑائی۔ مزدور میوے کے لدے ہوئے ٹوکڑے جلدی جلدی لے جا رہے تھے۔ فضلہ نے وقت کا اندازہ لگایا کہ آٹھ ساڑھے آٹھ بجے کا وقت ہوگا۔ علاوہ برین اسے بھوک بھی لگ رہی تھی۔ وہ گڈڑی لپیٹ کر مانگنے کے لئے تیار ہوا۔ آج کا دن شاید اس کے لئے منحوس تھا۔ کہیں سے ایک پیسہ بھی نہ ملا۔ خدا جلنے اس کے دل میں کیا آئی کہ وقت سے پہلے ہی اسٹیشن کی طرف چل دیا۔ ابھی اسٹیشن کے قریب پہنچنے نہ پایا تھا کہ ایک سُرخ رنگ کی کار آئی۔ اُس نے چاہا کہ جلدی سے نکل کر اطمینان کے ساتھ اُسے دیکھے۔ مگر دوسرے لمحے وہ اس کی جھپٹ میں آچکا تھا۔ کار کا پہیہ سینے پر سے پھر گیا تھا۔ فضلہ نے زور سے ہائے ہائے کہا۔ خون کی قے آئی۔ اور بیہوش ہو گیا۔ راہ گیر اکٹھے ہو چکے تھے۔ رعوت بھرے صاحب نے اس کو پھیلی نشست پر ڈال دیا اور ہسپتال کی جانب لے گیا۔

کار قرآنے بھرتی ہوئی منٹروں پر سے جا رہی تھی۔ لیکن فضلہ اس بات سے بالکل بے خبر تھا کہ وہ رولز رائیس میں اڑا جا رہا ہے۔ اور اس کی تمنا پوری ہو چکی ہے۔

## رُوداد ازندان

زندگی عزیز ہے۔ لیکن نہ جانے کیوں میرا دل اس سے سیر ہو چکا ہے  
وہ تمنّی ہے گہری نیند کا۔ ایسی نیند جس سے کبھی بیدار نہ ہو سکے۔

مجھے موت سے پیار ہے !

زندگی ! زندگی ہے بھی کیا مسلسل آہ و زاری کیسی واضطراب۔ اور  
ہس کی دبی دبی سہمی سہمی سانسیں ایسی ہیں جیسے بادِ خزاں کا طویل و غم انگیز  
راگ۔ ہم موت کو ایسے یاد کرتے ہیں جیسے کسی بچھرے ہوئے محبوب کو۔  
اور اگر اس سے خود ہمکنار ہونا چاہیں تو نہیں ہو سکتے۔

---

خاموش رات ہے۔ آسمان پر بادلوں کے چھوٹے بڑے ٹکڑے فیس  
آوارہ کی طرح پھر رہے ہیں کبھی کبھی ہوا سسکیاں بھرتی ہوئی سائی دیتی ہے  
تمام فضا اُداس کیوں ہے۔ ساحل مایوسی کی سیاہ لکیر کے ساتھ الگ  
روشنی جھلک رہی ہے۔

شعاع امید — کبھی کی بوجھ چکی۔ تاریکی کا غلبہ ہو گیا۔ تیرگی ہی تیرگی۔  
مجھے ایسا معلوم ہو رہا ہے۔ جیسے یہ زمین یہ آسمان اک سا رہے اور اس میں سے  
اک یاس انگیز راگ نکل رہا ہے۔

تصورات میں ایک پیکر متحرک ہوا۔ لو وہ قریب آ گیا  
شگفتہ چہرہ۔ دوہنستی ہوئی آنکھیں۔

تصور نے اک انگڑائی لی — وہی مسکراتا ہوا پیکر اُداسی و حزن  
کی تصویر ہے۔ آنکھوں میں آنسو جھلک رہے ہیں۔

میں مادرِ وطن کی حفاظت کے لئے مقدس سرزمین کو ناپاک کر نیوالوں  
سے جنگ کرنے جا رہا ہوں اور وہ مجھے الوداع کہہ رہی ہے۔  
ٹن — ٹن — دو بج گئے۔

پہرہ دار کے گانے کی آواز آرہی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ بارک کی  
طرف جا رہا ہے۔ گانے سے وہ نیند کو دور کرنا چاہتا ہے۔ یا اُداس رات  
کی پڑمردگی سے بچنا چاہتا ہے۔ یہ تو وہی جانے

گیت کتنا دلسوز ہے۔ شاید اُسے اپنا گاؤں۔ اپنا گھر کھیت اور  
محبوب یاد آ رہا ہوگا۔ آہ اگزرے وقت کی یاد بھی کتنی زبردست ہے۔ ہم  
اس سے کتنا ہی بچنا چاہیں محفوظ نہیں رہ سکتے۔

”میرے محبوب!“

تم نے لہلہاتے کھیت کی منڈیر پر جاتے جاتے دُرویدہ نگاہوں سے  
دیکھا۔

اور کہا۔ مجھے نہ چھیڑنا۔  
لیکن تمہارا مطلب اس کے برعکس تھا۔  
میں نے تمہیں کہا۔ ذرا ٹھہرو تو۔  
اور تم نے اشارے سے کہا۔ کوئی دیکھ لیگا۔  
اور تم پاس سے گزر گئے

اس کے بعد کئی بار ہم نے چھپ چھپ کے ملاقاتیں کیں۔  
اب میں پردیس میں ہوں۔ لیکن تم نے کبھی کوئی خیام نہیں بھیجا۔  
تو انگریزوں نے مجھے موت ہی آجائے۔  
موت! پہرہ دار بھی موت کا خواہشمند ہے کتنی عجیب بات ہے۔  
ایک موت اور اس کے چاہنے والے لا تعداد۔  
اس کے دل میں بھی اک آرزو ہے۔ موت کی۔  
لیکن کتنا بولا بھالا ہے۔ شاید یہ نہیں جانتا کہ اس کے محبوب نے  
تو اسے کب کا فراموش کر دیا۔

---

آج تمام دن مجھ پر غم کی ایک کیفیت طاری رہی۔ اس دوران میں اگر  
کوئی چیز تسکین دہ تھی۔ تو وہ شوریدہ سر سمندر کی کف آلودہ لہریں بیتاب

ہو کر جیل کی سنگین دیواروں کے ساتھ سر مار تی تھیں۔ اور پھر شدتِ درد سے کراہتی ہوئی سمندر کی لہروں میں مل جاتی تھیں۔ جیسے جیون ساگر کی لہریاں آپس میں ملی جلی ہوئی ہیں۔

ہوا کی سنسناہٹ کا شور۔ جیل کی تنگ و تاریک کوٹھری تک سنا ہی دیتا تھا۔ شام کی تاریکی ایسے پھیل رہی ہے۔ جیسے موت اپنا سرد ہاتھ دھیرے دھیرے بڑھاتی ہے

تنہائی!

توبہ! توبہ! کس قدر اذیت دہ ہے۔

یہ زنداں بھی تو اس لئے آباد ہے کہ اس میں ایک قیدی زندگی کے درد بھرے لمحے گزار رہا ہے۔ قیدی کے بغیر زندان کی کیا قدر و قیمت! مرغ گرفتار کے بغیر۔ خالی پیجرہ کس کام کا۔

دُکھ کے لمحے میرے لئے ناقابلِ برداشت نہیں لیکن مجھے پچھنی ہو تو صرف اس بات کی کہ ان کا خاتمہ کب ہوگا۔ اگر یہ دُکھ مجھے شعلہ جوالہ بنا کر خاکستر بنا دے تو اچھا ہے۔

شلگتی آگ میں جلنا جہنم کے عذاب سے بدتر ہے لیکن تنہائی کی آگ دھیرے دھیرے میری رگوں میں اُتر رہی ہے مجھے یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ میں جو کچھ چاہتا ہوں۔ وہ اس دنیا میں تو ممکن نہیں۔ لیکن پھر بھی اس مسافر کی طرح جو پانی کے دھوکے میں سراب کے پیچھے دوڑتا ہے۔ میں بھی لپک رہا

ہوں اور سچ پوچھو تو میں کبھی گلہ نہیں کرتا۔ شکوہ نہیں کرتا۔ دکھ آئے تو پروا نہیں  
سکھائے تو خوشی نہیں۔

میری زندگی تو اس دیئے کی طرح ہے جو گورغریباں پر ٹٹا رہا ہے۔ دجائے  
کس وقت ہوا کا ایک جھونکا اسے زمین پر ٹک دے۔ اور پھر اس کی حالت یہ  
ہوگی کہ تیل کہیں اور بتی کہیں۔

زندگی کی شاہراہ پر ریگتے ریگتے ٹھک گیا ہوں۔ اور بہت جلدی منزل  
مقصود پر پہنچ جانا چاہتا ہوں

کیا غم و اندوہ کے بادل پھٹ جائیں گے۔ یہ اور بھی تاریک ہو جائیں گے  
اس سے زیادہ اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔ کیا یہ دلچسپ بات نہیں کہ دشمن  
سے مادر وطن کی حفاظت کی خاطر نبرد آزما ہو کر قید و بند کی صعوبتیں برداشت  
کر رہا ہوں۔ تم کہو گے کہ میں نے اس کے لئے بہت زیادہ قیمت ادا کی ہے۔ لیکن اگر  
مجھے اب آزادی نصیب ہو جائے تو میں پھر سر رکھن باندھ کر میدان کارزار میں  
چلا جاؤں۔

اس خیال سہی میرے ان کمزور دہرے سکت بازوؤں میں طاقت عود کر آئی ہو۔

کل سے تمام قیدی سڑک بنانے کے لئے باہر جائیں گے۔  
اس تنہائی سے تو رہائی نصیب ہوگی۔ لہذا ہائی کھیتیاں نظر آئیں گی۔

درختوں میں ہری ہری کوئلیں پھوٹ رہی ہوگی۔ پرندے چپچپا رہے ہوں گئے  
کائنات پھر سے جاگ اُٹھے گی۔ چرودا ہوں کے مدھر گیت فضا میں گونج رہی  
ہوں گے زمین پر سبزہ ہی سبزہ ہوگا اور چرخ نیلوذری پر شاہ خاور پر شکوہ انداز سے  
چمک رہا ہوگا۔

لیکن کیا ایسا ہوگا؟ یا محافظ تمام باتیں صرف قیدیوں کے دل بہلانے کیلئے  
کہہ رہا تھا۔ مجھے اسکا اعتبار نہیں آتا، کہ میں فطرت کی رنگینیوں سے حطاً اٹھا  
سکوں گا۔

صبح ہوگی۔ پہرہ دار تمام قیدیوں کو زنداں سے نکال کر باہر لے جائیں گے  
کوئی پتھر کوٹیکا۔ کوئی شرک پر پتھر بھائیگا۔ شاید بہت سے لوگ ہوں گے۔ خوب  
مزہ رہے گا۔ نہ جانے کب تک کام رہے۔ ایک ماہ۔ دو۔ تین۔ یا شاید برس  
بھر۔ لیکن اتنا تو ضرور ہوگا کہ اس زندگی میں تبدیلی تو ہوگی۔ چونکہ انسان بھی  
متلون مزاج ہے۔ اس لئے وہ تبدیلی کو بڑا پسند کرتا ہے۔ اگر موصموں میں تغیر  
و تبدل نہ ہو۔ دن رات۔ صبح و شام کا وجود نہ ہو تو اس کے لئے زندگی و بال  
جان ہو جائے۔

زنجیروں سے چور چور ہوں۔ آہ مجھ سے تو ہلا تک نہیں جاتا کئی دنوں  
تک کوٹھڑی سے باہر نہیں جاسکوں گا لیکن ان تمام باتوں کے باوجود مجھے  
خوشی ہے۔ میں مادر وطن کی توہیں برداشت نہ کر سکا۔  
مزدور انسان کو یہ حق بھی نہیں پہنچتا کہ وہ اس کے خلاف صدائے احتجاج

بلند کرے۔ اگر میرے ساتھی قیدی سے کام جلدی نہیں ہو سکتا تھا تو دشمن سپاہی کو کوئی حق نہیں تھا کہ وہ میرے وطن کی توہین کرتا۔

وہ دن دور نہیں جب حق و صداقت کی فتح ہوگی اور جبر و استبداد کا خاتمہ ہو جائیگا، انہیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جنگجو اور آزاد قوم کے افراد کبھی بے عزت اور بے حمیت نہیں ہو سکتے۔

میں یہ نہ دیکھ سکا۔ کہ بے قصور انسان نشانہ ستم بن جائے۔

مجھے تڑاق ترطاق کی آواز نے چونکا دیا۔ اس کے بعد میں اور سپاہی گتھم گتھا ہو گئے۔ مجھے افسوس ہے کہ اس کے ساتھی آپہنچے۔ ورنہ میں اس کا کام تمام کر دیتا۔

---

یہ باغی قیدی ہے۔ اسے گولی سے اڑایا جائے گا۔

ہا۔ ہا۔ جسم کو برباد کیا جاسکتا ہے۔ مگر روح و دل تو برباد نہیں ہو سکتے۔

حق و صداقت کی آواز کو ظلم و جور سے نہیں دبایا جاسکتا۔ جقدر تشدد کیا جائیگا سچائی کی آگ زیادہ بھڑکے گی۔ اور ارگرد کی تمام چیزوں کو جلا کر خاکستر بنا دیے گی۔

---

## رقاصہ کے نام محبت نامے

بھئی کی بہترین رقصہ ماہ افشاں جب بیدار ہوئی تو اُس نے اُٹینہ کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے آپ کو دیکھا۔ اس کے سیاہ گیسو دوش پر بکھرے ہوئے تھے جہاں آلودہ آنکھوں سے کیف و مستیاں جھلک رہی تھیں۔ اس نے انگڑائی لی۔ رات کے واقعات ایک ایک کر کے اُسے یاد آئے لگے گزشتہ رات کو وہ کیفے ڈی پیرس میں رقص کے بعد رشید کے ساتھ رولز رائیس میں سوار ہو کر مکان پر آئی تھی۔ جاتی دفعہ رشید نے کہا تھا — پیاری ماہ افشاں!

میں جا رہا ہوں۔ جاتے ہی تمہیں خط لکھوں گا۔ نہیں بہنیں!! خط لکھنے کی ضرورت نہیں۔ جانے سے پیشتر مجھے ٹیلیفون کر دینا۔

”نصف شب بیدار رہنے کے بعد میں تمہیں صبح صبح بیدار کر کے تمہاری نیند میں خلل انداز نہیں ہونا چاہتا؟“ رشید نے کہا۔

تو خط بھی لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں خط تو جب لکھے جائیں جب کسی سے معذرت کرنی ہو۔

اور — وہ دونوں مسکرا دیئے تھے۔

یہ طویل خط نہیں ہوگا۔ صرف چند الفاظ

ثانیہ — تم اسے پڑھ کر مہنو!

ماہ افشاں سوچنے لگی۔ یہ سب مجھ سے محبت کا دم بھرتے ہیں۔ مجھے خود اب تک سچی محبت کی قیمت معلوم نہیں۔ یہ لوگ مجھے اپنے سر کا تاج بناتے ہیں میرے ہاتھوں کو دالہا نہ انداز میں چومتے ہیں میرے حُسن کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں۔ لیکن اس حقیقت سے نا آشنا ہیں کہ میں ایک چشتہ ہوں جس کو پیاس لگی ہو۔ آئے اور بچھائے۔

میں ایک راز سر بستہ ہوں اور حسین صورت ہوں جنھیں نفس امارہ کے شعلے نے پھونکا ہوتا ہے۔ اُنھیں میرے آغوش میں ٹھنڈا کر ملتی ہے۔

پرسوں رات جو میرے بازار حُسن میں نیا خریدار آیا تھا۔ وہ کیسا خوبصورت اور سمیلا نوجوان تھا۔ وہ مجھے والکیشور لے گیا تھا۔ رات بھگی ہوئی تھی بتسام کائنات نے تاریکی کا بادہ اوڑھ لیا تھا جو انی کی طوفانی ندی میں ایک سیلاب آیا ہوا تھا۔

وہ تو مجھے پریتا ہی کہہ کر پکارتا رہا اور جب وہ جُدا ہونے لگا تو مجھے امید نہ تھی کہ وہ پھر کبھی آئیگا۔ لیکن۔ اگر وہ آجائے۔ تو —

پھر اُسے ایک بیوقوف امیر زادہ کا خیال آیا جس نے اُسے موتیوں کی خوبصورت مالا لاکر دی تھی۔ اس نے بھی محبت نامہ میں شب فراق کی طول و طویل داستان لکھی۔

میری اپنی پیاری ماہِ انشآں! خدا تمہارے حُسن کو جادو دانی تابش عطا کرے۔ تم سے جُدا ہو کر مجھے ایک لمحہ بھر بھی قرار نہیں۔ تمہاری رعنائیوں اور حُسن جہانِ سوز سے دل میں اک آتشِ عشق بھڑک رہی ہے۔  
دن کے صبحین رات کے آرام سے محروم ہوں۔ دل کو لاکھ سمجھانا ہوں۔ مگر یہ نادان۔ یہ دیوانہ کچھ سمجھتا ہی نہیں  
مجھے اپنی تصویر تو ارسال کر دیں۔ تاکہ قلبِ مجروح کو کچھ تسکین تو حاصل ہو جائے۔

فقط تمہارا

مجھے اس کی کیا پرواہ! اُس نے مجھ کو خیالات کو اس طرف سے مبٹانا چاہا۔ مگر ایسا نہ کر سکی۔ وہ اپنی خیالات میں مستغرق تھی کہ ملازم نے نیلے رنگ کے گلابی رنگ کے دو لفافے لاکر دیئے۔  
اُس نے نیلے رنگ کے لفافے کو چاک کیا۔  
یہ گزشتہ شب کے نو گرفتارِ صید کی طرف سے تھا۔  
نہایت ہی مختصر

میری چپلی تیزی۔ میں بخیریت پہنچ گیا ہوں۔ ملنے کی کوشش کروں گا۔  
ہمیشہ کے لئے

صرف تمہارا

وہ مسکرا دی۔ ہر ایک شخص مجھے۔ میری اپنی۔ صرف تمہارا لکھا ہے۔

جب آئیگا تو دیکھا جائیگا۔

گلابی رنگ کا لفافہ چاک کرنے پر اُس میں سے ایک ہزار روپیہ کا چک نکلا۔ اور ساتھ ہی اسے صاحب کی طرف سے ”تاج محل“ میں اُسے ایک ڈنر پر مدعو کیا گیا تھا۔

ماہ افستائے مسکرا کر دونوں لفافے سنگار میز کی دراز میں رکھ دیئے اور خادمہ کو چائے لانے کا حکم دیا۔

---

# خاموشی

بینا ڈرائیونگ روم میں بیٹھی ہوئی سوچ رہی تھی کہ جو بات میں نہیں چلی ہتی  
کیا وہ ہو کے رہے گی۔ ؟

میں اپنا پتا سے یہ کہتے کہہ دوں کہ مجھے یہ رشتہ پسند نہیں۔ میں سرکش  
سے کبھی بھی پریم نہیں کر سکتی۔ عمر بھر کا بندھن ٹوٹے نہیں ٹوٹ سکے گا۔  
لیکن یہ بات ہو کر ہی رہے گی۔ میں کیسے سمجھا دوں کہ میں نے دل کے  
سنگھاسن پر ریش کو بٹھالیا ہے۔ میں اُسے والہانہ طور پر پُوج رہی ہوں۔ میں نے  
یہ نہیں سوچا کہ وہ خوب رو جوان ہے۔ اعلیٰ قابلیتوں کا مالک ہے۔

نہیں نہیں بلکہ میں نے اس کے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں پریم کو دیکھا ہے  
میں نے آشائوں کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ مجھے ناامیدی کی بھیک نہیں ملی۔

میری مُرت و راحت کی دنیا اس کے دم سے وابستہ ہو۔ اگر میرا یہ  
آخری سہارا بھی ٹوٹ گیا — تو میری زلیبت کا کچا دھاگہ بھی ٹوٹ جائے گا۔  
میرے سامنے دو ہی راستے ہیں۔ یا تو ریش کی ہو جاؤں یا زندگی کا خاتمہ کر لوں۔  
ریش میرے وعدوں پر زندگی کے لمحے گزار رہا ہے۔

میں اٹھایا ہوا قدم کبھی بھی پیچھے نہ ہٹاؤں گی۔  
لیکن والدین یہ چاہتے ہیں کہ میری تنہاؤں کی کلیوں کو نوچ کر پاؤں  
تے روند ڈالیں۔

سماجی نظام — شرم و حیا، کا تقاضا یہی ہے۔ کہ میں اس بارہ  
میں ایک لفظ تک نہ کہوں۔ مجھے بھیانک اور اندھیری غاریں دھکیل دیا جائے  
تو اُن تک نہ کروں۔

نہیں۔ نہیں۔ میں ایسا ہرگز نہ ہونے دوں گی۔  
خیالات کی الجھنوں سے گھبرا کر وہ اُٹھی اور دوسرے کمرہ میں جا کر الماری  
میں سے ایک شیشی اُٹھائی۔ اور اس کے چند قطرے حلق میں ٹپکا لئے۔ زان بعد  
اپنے کمرے میں جا کر بستر پر لیٹ گئی۔

(۲)

بینا کے والد کنور بہار راج اچھے کھاتے پینے آدمی تھے۔ ان پر نرسہ بی  
تہذیب نے بڑا گہرا اثر ڈالا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ لڑکیوں کو بھی حق حاصل  
ہے کہ وہ بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کریں۔ وہ اس میں کوئی قباحت نہیں سمجھتے تھے۔  
کہ لڑکی کے لئے موزوں جگہ کالج نہیں بلکہ گھر کی چار دیواری ہے۔

اسی خیال کے پیش نظر انھوں نے بینا کو دسویں جماعت پاس کرنے کے  
بعد کالج میں داخل کرا دیا تھا۔

بینا اُن کی اکلوتی لڑکی تھی۔ اس لئے وہ اسکی تعلیم پر بے دریغ روپیہ

صرف کر رہے تھے۔ جہاں تک ان کی خوشنودی کا تعلق تھا۔ مینا نے کبھی بھی ان کو شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔ وہ بی، اے پاس کر چکی تھی اور پولیٹیکل سائنس کا ایم، اے کر رہی تھی

اب مہاراج کنور اس کی شادی کی فکر میں تھے۔ کہ اپنے جیتے جی بیٹی کا گھر آباد دیکھ لیں۔ اُنھوں نے کتنے ہی امیر زادوں کا انتخاب کیا۔ لیکن کوئی بھی ان کے معیار پر پورا نہ اُترا۔ بالآخر..... اُن کے ساتھ کے کھیلے دوست کا لڑکا سریش ان کی نظروں میں قبولیت حاصل کر سکا اور اُنھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ بیٹا کی شادی سریش سے کر دیں گے۔ سریش بھی اپنی عملی زندگی میں کامیاب تھا۔ وہ ایم، بی، بی، ایس تھا۔ دن بدن پیکٹس چمک رہی تھی۔ بیوک کی شاندار کار کے علاوہ عالی شان کوٹھی کا بھی مالک تھا۔

مہاراج کنور کے خیال میں بیٹا کو سریش کے ہاں کسی قسم کی تکلیف کا امکان نہ تھا۔ مگر وہ شاید اس بات سے بے خبر تھے کہ مینا سریش کو چاہتی ہی نہیں بلکہ نفرت کی نگاہوں سے دیکھتی ہے۔ اور اس نے اپنی زندگی کا ساتھی منتخب کر لیا ہے وہ اُسکا ہم جماعت ریش تھا۔

ریش کے والدین نہ ہی تو امیر تھے اور نہ ہی ان کے پاس بنگلہ تھا۔ اور نہ کار تھی۔ مگر مینا کو اس چیز کی ضرورت نہ تھی۔ اُس نے محبت کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے وعدوں کے سہارے جیون کے لمحے بسر کر رہے تھے۔

میں پیاسی تھی۔ میں نے چشمہ ڈھونڈ لیا۔ اب میں کنارہ کشی نہیں کر سکتی  
ریش بینا کی یہ باتیں سنتا اور کہتا۔ بینا — کیا تم سچ کہہ رہی ہو! مجھے تو اس کا  
یقین نہیں۔

بینا کہتی۔ ریش! تمہاری قسم یہ سچ ہے۔ کیا تم عورت کی فطرت سے  
واقف نہیں۔ وہ ایک ہی دفعہ پریم کرتی ہے۔ میں تمہیں کبھی نہیں چھوڑ سکتی۔  
بینا کے وعدے ریش کی زندگی تھی۔ بینا ابھی تک کمرے سے نہیں آئی  
کنور تمہارا راج بولے۔ پھر انھوں نے نوکر سے مخاطب ہو کر کہا۔ بھولے۔ بی بی  
سے جا کر کہو۔ ہم آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔

بابو جی۔ وہ تو اپنے بستر پر بیہوش پڑی ہیں۔ بھولے نے سر اسیمہ ہو کر کہا۔  
یہ سنتے ہی بینا کی ماما اور کنور اُسکے کمرے کی طرف لپکے۔ واقعی بینا بیہوش پڑی  
تھی۔ کنور نے نبض دیکھی۔ اُس کی رفتار بڑی ہی تیزی تھی۔  
اُسوقت کنور کو تو کچھ سمجھ نہ آئی ماسوائے اس کے کہ سریش کو ٹیلیفون کر کے

بُلا لیا جائے

ہیلو۔ سریش!

ہاں۔ میں کنور تمہارا راج بول رہا ہوں۔ بینا بستر پر بیہوش پڑی ہے نبض کی  
رفتار بہت دھیمی ہے۔

نہیں۔ نہیں۔ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ رات تو بالکل تندرست تھی۔  
دیر نہ کیجئے گا۔ اتنا کہہ کر انھوں نے ٹیلیفون کا ریور رکھ دیا اور کمرہ میں

بیٹھ کر ڈاکٹر کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد ڈاکٹر سریش اپنی کار پر آگیا۔ نبض دیکھی اور کہہ کہ بتیانے کوئی زہریلی شے کھالی ہے۔ آپ کو اچھے وقت پر معلوم ہو گیا۔ ورنہ چند لمحوں تک زہر اپنا کام کر چکی ہوتی۔

گھبرائیے نہیں۔ میں دوا دیتا ہوں۔ اس سے بیہوشی دور ہو جائے گی۔ واقعی سریش نے جو دوائی دی۔ اس نے فوراً ہی اثر کیا۔ بتیان کی بیہوشی بتدریج کم ہو رہی تھی

بتیان کے بلے بلے سیاہ بال چہرہ پر بکھرے ہوئے تھے۔ کانوں میں پڑے ہوئے نازک نازک آویزوں کے موتی ہلکی ہلکی چمک دکھا رہے تھے۔

سریش بخشکی لگائے اس کے حسین چہرہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ جب بتیان اس کی ہو جائے گی تو وہ ان لبوں کو بتیانہ چوم لیا کرے گا۔

مگر اسے کیا معلوم کہ بتیان اس کی نہیں۔ بلکہ زمیش کی ہو چکی ہے۔ اور اس کی انبیدوں کا محل آن کی آن میں ریت کے گھروندے کی طرح برباد ہو جائے گا۔ اس ہی لمحہ بتیان نے کروٹ بدلی۔ اور آہستہ آہستہ کہا۔

زمیش اب تو آپ کو میرے وعدوں کا اعتبار آیا۔ میں مر رہی ہوں میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ آہ تہارے بغیر — یہ جیون — کس کام کا۔

یہ سنکر نور ہمارج کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ وہ زور سے بولے۔

بیتا! — بیتا!

بیتا نے ایک لمحہ کے لئے اپنی آنکھیں کھولیں اور سرشیش کو دیکھ کر لہجہ

بند کر لیں۔

کمرہ میں خاموشی چھا گئی۔ تمام لوگ کسی گہری سوچ میں متفکر تھے۔ لیکن  
بیتا کی خودکشی کا مہمہ حل ہو چکا تھا۔

---

## پر دیسی ماہی

لیلیٰ شب نے اپنی لابی لابی سیاہ زلفیں بکھر کر کائنات پر ایک سیاہ  
چادر تان دی تھی۔ آسمان پر دوسری کا دُھندلا سا چاند روشنی کی پھکی پھکی کرنیں دینے  
لگا رہا تھا۔ خاموش فضا میں ڈھولک کی دھپ دھپ کے ساتھ۔

”اکھیاں دی دے گیا سائی تے مڑ کے نہ آیا یو پار ی ماہی“ کا گیت  
ہواؤں میں نہرانا ہوا نازو کے کانوں تک پہنچ رہا تھا۔ اس گیت نے اس کے  
احساسات کو ایک شدید ضرب لگائی تھی۔ محلے میں شادی تھی۔ نوجوان لڑکیاں  
ڈھولک کے ساتھ یہ گیت گا رہی تھیں۔ گیت سُکر نازو کے دل میں درد کی ایک  
لہر اٹھی۔ ہجوم خیالات نے اس کے دل و دماغ میں ایک حشر بپا کر دیا۔  
شباب! وہ شباب کے اس دور میں تھی جب ایک نوجوان عورت یکسر

تنتابن جاتی ہے۔

دل نال دل میا سی۔ پھل آسان والا کھلیا سی؛  
یہ سنکر نازو کا دل چاہا۔ کہ کوئی اسے اسقدر بھیج بھیج کر پیار کرے کہ اسکی  
اندر کی سانس اندر اور باہر کی سانس باہر رہ جائے۔ اس کی گردن میں کسی کے

۱۵ آنکھوں کا بیجا نہ دے گیا۔ مگر آپ پر دیسی چلا گیا۔ ۱۶ ابھی تو دل سے دل ملا تھا اور میرا کچھول کھلا تھا

طاقتور باز و حامل ہوں۔

چند ہجرتوں نے آن دبا بی تے ٹرکے نہ آیا بیو پار ہی ماہی  
گیت کے بولوں کے ساتھ ہی ساتھ اس کے تصورات میں حرکت ہو رہی تھی۔  
اسے وہ دن یاد آ رہا تھا جبکہ شادی سے پہلے وہ سرسوں کے اہلہاتے ہوئے  
کھیت کی منڈیر پر

بیبا دے راہ جان دیاں

نہ چھیڑ بیگانیاں ناراں

گاتی ہوئی جا رہی تھی۔ اس کے ہر قدم پر قیامت کے فتنے پیدا ہو رہے  
تھے۔ سامنے کی سمت سے شہاب آ رہا تھا۔ اُس نے چاہا کہ وہ شہاب سے  
پکڑ لے جائے۔ اُس نے شہاب کو دیکھتے ہی گانا بند کر دیا۔  
مگر شہاب اس کی جانب آ رہا تھا۔ نزدیک آ کر اُس نے کہا: ”نازو“ — وہ  
بجاسی گئی۔

”ابھی ابھی تو کیا گیت گارہی تھی۔“

وہ خاموش تھی۔ ”ارے تم ردھ گئیں۔“

”نہیں“ اتنا کہہ کر وہ تیزی سے قدم اٹھاتی ہوئی گاؤں کی جانب چل دی

شہاب بُت بنا اُسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

یہ ناز و اور شہاب کی رومان پر در ملاقات تھی۔ دو دو جوان رو حیں محبت  
کی مدھ بھری مے سے مخمور ہو چکی تھیں۔

”کیوں عشق دی آگ بھڑکائی تے مڑ کے نہ آیا بیوپاری ماہی“

چاند کی رومان پرور راتوں میں۔ وہ کتنی ہی بار ایک دوسرے سے ملے۔ اور پھر اس کی بھنک دونوں کے والدین کے کانوں میں پڑ گئی۔ لڑکیوں نے ایک دفعہ پھر ”کیوں عشق دی آگ بھڑکائی“ اس بول کو دہرایا۔ نازد کے خیالات نے بیکایک انگڑائی لی۔ اُسے اپنی شادی کا دن یاد آیا۔ اس کے ہاتھوں میں مہندی لگی ہوئی تھی۔ اس نے کیسری رنگ کا جوڑا پہنا ہوا تھا۔ وہ سسٹی سسٹی بٹھی تھی۔ اس کے گرد ہیلیوں کا جھرمٹ تھا جو اُسے چھیر رہی تھیں۔ مگر اسکا تصور شہاب کی طرف تھا۔ سہرہ کی زرتار لڑیوں سے اسکو شہاب کا چہرہ نظر آ رہا۔ وہ سوچ رہی تھی۔ کہ محبت کی اربان بھری راتیں کس مستدر حسین تھیں۔ جب وہ دونوں کسی کھیت کے کنارے باہوں میں باہیں ڈال کر محبت کے گہوارے میں جھولتے تھے۔ چاند کے سوا انھیں کوئی آنکھ نہ دیکھتی تھی۔ مگر نازد کے بیاہ کی خبر سن کر شہاب فوج میں بھرتی ہو کر ملک سے کالے کوسوں دور چلا گیا تھا۔ وہ بیچارہ بے بس تھی۔ اگر ایک طرف محبت تھی تو دوسری طرف خاندان کا خیال تھا۔ آج وہ اپنی تھی۔ اسے شہاب، رہ رہ کر یاد آنے لگا۔

ناز و شدت غم سے رونے لگی گیت کی آواز ہوا میں لہرا رہی تھی۔  
نہ آیا — آیا — نہ پر دیسی ماہی گیت کے بولوں کے ساتھ ساتھ  
اس کی سسکیاں بھی ہمنوائی کر رہی تھیں۔

# تلاش ناکام

سڑک گہرے اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ صرف ٹاڑی کی دکانوں میں  
 مدھم سے جلتے ہوئے چراغوں کی روشنی کانپ رہی تھی جھپٹن لال نے سڑک کو  
 پار کیا اور ٹاڑی کی دکان میں داخل ہو گیا۔ اسکا بدن تھکاوٹ سے چور چور تھا  
 مبہی شہر کوئی گاؤں یا معمولی سا قصبہ تو نہیں۔ اور پھر اس شہر کی کونسی سڑک  
 تھی جس کی خاک اس نے نہیں چھانی تھی۔ راستہ میں بھی اس کی یہی حالت رہی  
 کہ وہ پاؤں کہیں دھرتا اور پڑتا کہیں تھا۔  
 مگر اس نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ اس کے من میں ایک ہی خیال تھا ایک  
 ہی ارادہ یعنی اپنے گمشدہ بچے کی تلاش۔

یہ اس کے معمول میں داخل تھا کہ آدھی رات گزرنے کے بعد وہ ٹاڑی کی  
 دکان میں آتا۔ اسکا ایک گلاس پتیا اور پھر اپنے چالے کی راہ لیتا۔  
 رات کی بقیہ گھڑیاں اسکی تنگ و تاریک کوٹھری میں گذرتا۔ اور پھر صبح  
 اس کی تلاش جاری ہو جاتی۔

ایک رات حسب معمول وہ دکان کے ایک گوشے میں بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ ولے کوٹنے سے باتوں کی آواز سنائی دی۔ وہ اُدھر چلا گیا۔ مزاج پرسی کے بعد بنواری نے کہا۔ کچھٹن لال آج کل کیسے گذرتی ہے۔ یہ سنکر اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے اور اُس نے نہایت بیدلی سے کہا۔

”مجھے تو لڑکے کا فکر کھائے جا رہا ہے۔ کل بنسی کا لڑکا کہہ رہا تھا کہ مادھو کلکتہ کے ایک مارواڑی کے ساتھ چلا گیا ہے۔ مگر مجھے تو یقین نہیں آتا۔ اتنا کہہ کر ایک ہی گھونٹ میں اس نے تاڑی کا گلاس خالی کر دیا۔

”اس نے اپنے بوڑھے باپ کے بڑھاپے کا بھی خیال نہ کیا۔ یہ کہتے ہوئے وہاں سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور اپنے چالے کی طرف چلا گیا۔

باہر میدان میں دھوبی تاڑی کے نشہ سے مخمور ہو کر بے ڈھنگے سُروئیں زور زور سے گیت گارہے تھے گیمبی گیمبی کوئی مینلا شرابی فلمی گیت بغیر سُر اور تال کے الاپنا شروع کر دیتا تو اسپر ایک دم گالیوں کی بوچھاڑ شروع ہو جاتی۔ وہ انہیں بُرا بھلا کہتا ہوا، کوٹھری میں چٹائی بچھا کر لیٹ گیا۔ یہ بد قسمت انسان اکیلا تھا۔ وہ سوچنے لگا۔ آج سے بیس سال قبل اس کی بیوی۔ بچہ اور وہ تینوں اس شہر میں روزی کی تلاش میں آئے تھے۔ بیوی کو مرے ہوئے پندرہ برس سے زیادہ عرصہ ہو گیا تھا اور اب اور اُس کا بچہ تھے۔ جب اس کی بیوی مری تھی۔ تو بچے کی عمر صرف پانچ سال کی تھی۔ وہ اس کے سہارے بیوی کے غم سے بے نیاز ہو کر زندگی کے باقی دن گزار رہا تھا۔ اُس کا مستقبل تاریک ہو چکا تھا۔ میں اب بوڑھا ہو گیا ہوں۔ میرا لڑکا جو ان

ہو گیا ہے۔ اب وہ کمائے گا اور میں آرام سے وقت گزاریوں گا — مگر نہیں وہ تو اب لوٹ کر نہیں آئیگا — اور یہ سوچتا سوچتا سو گیا۔

اس واقعہ کو کئی برس کا عرصہ گزر چکا تھا۔ مگر بوڑھے کی تلاش روز اول کی طرح جاری تھی۔ محنت مزدوری کرنے کے بعد وہ شام کو لوٹ کے کی تلاش میں مارا مارا پھرتا۔ جہاں اس کے ہم عمر لڑکے دیکھتا، اُن سے پوچھتا۔ ”میرا لڑکا تو نہیں دیکھا۔ تم نے؟“  
”نہیں“

اور ان کا مایوس کن جواب ”نکرا اُس کی نوزائیدہ امید دم توڑ دیتی۔ اور بعض اوقات بھوک کی شدت اُسے نڈھال کر دیتی۔  
ایک شام وہ انہیں نگلیں خیالوں میں گھویا سڑک کو بنو کر رہا تھا کہ ایک موٹر کی جھپٹ میں آگیا اور زخموں کی وجہ سے بہوش ہو گیا۔ ڈرائیور نے موٹر روک لی۔ اور جلدی سے اُسکا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔  
وہ دھیمے دھیمے بڑبڑا رہا تھا — وہ کبھی نہیں آئیگا — میں اکیلا تھا۔  
اور اکیلا ہی چلا جاؤں گا —“ لیکن اسے کیا معلوم کہ جس کی تلاش میں وہ مارا مارا پھر رہا تھا۔ وہ اُسے مل چکا تھا

# بھولی لبری بات

”مجھے تم سے محبت ہے۔“

یہ الفاظ ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں

اُس کی آواز کتنی رس بھری اور میٹھی تھی

اور محبت اس کی آنکھوں میں انگڑائیاں لے رہی تھی

نزدِ پمانے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ کیا تم مجھے چھو کر تو نہیں

جاؤ گے!

گذرے برس کے موسم سرما کا ایک خوشگوار دن تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے

گستخ جنون کے نزدِ پما کے لانسبے لانسبے نرم و ملائم بالوں سے شرابتیں کر رہے تھے

جنمیں وہ بار بار اپنے رخساروں سے ہٹاتی تھی۔ مگر ہوا کو شاید اس چھڑخانی

میں مزہ آرہا تھا۔

نزدِ پمانے میرا بازو اپنے نرم و مرمری ہاتھوں میں تھاما ہوا تھا۔ اور

ہم دونوں پہاڑی کی چوٹی پر گھڑے۔ بہت پرے سنگتروں کے باغیچوں

کے نظارہ سے دل بہلا رہے تھے۔

دھوپ میں پھولوں اور پھلوں سے جھکی جھکی ڈالیاں ایک ناقابل بیان منظر پیش کر رہی تھیں۔ ہوا میں اک بھینی بھینی خوشنویسی ہوئی تھی۔ اور تھوڑے ہی فاصلہ پر دھوپ میں میراٹومی "کتا لیٹا ہوا تھا۔"

"آؤ تو ذرا تھوڑی دیر کے لئے ادھر ادھر گھومیں۔" نروپا نے کہا۔ آج کا دن کتنا دلغریب ہے۔

"ٹوٹی" ہمارے آگے آگے بھاگتا ہوا۔ نہیں بلکہ ہوا میں اڑتا ہوا جا رہا تھا۔

ماحول سراپا محبت تھا۔

نہ جانے نروپا نے ماحول سے متاثر ہو کر کہا تھا۔ "مجھے تم سے محبت ہے۔" یا یہ عورت کی پہلی اور آخری محبت تھی۔

"کیا تم جانتے ہو؟"

میں نے اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا۔ کیا؟

"ہمارے قبیلے میں یہ رسم ہے کہ عورت جب ایک شخص کو منتخب کر کے اُس

سے اقرار محبت کرتی ہے تو پھر دوسرے سے شادی نہیں کر سکتی۔"

میں یہ منکر ہڑسا گیا۔ اور میرے دماغ میں کتنے ہی خیالات ایک دم جمع ہو گئے۔

"ٹھیک ہی تو ہے۔"

عورت دنیا میں صرف ایک دفعہ محبت کرتی ہے۔ میں نے کہیں پڑھا

تھا کہ عورت کا دل ایک سرائے نہیں ہوتا۔ وہ محبت صرف ایک انسان سے

کرتی ہے۔ اور وہ دروازہ صرف ایک بار کھل کر ہمیشہ کے لئے بند ہو جاتا ہے۔  
یہ موجودہ تہذیب و تمدن سے دور افتادہ لوگ دنیاوی و سماجی فلسفہ کو  
کتنی اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ اور ان کی زندگی کے اصول کتنے سادہ ہیں۔  
مگر تم چھوڑ کر تو نہ جاؤ گے؟

کرشن چندر کی نیرانے بھی تو اپنے محبوب سے یہی کہا تھا۔  
مگر وہ لوٹ کے نہ آ سکا۔ نہیں۔ نہیں۔ میں ایسا ہرگز نہ کروں گا۔  
یہ دستور تو دنیا بھر سے انوکھا ہے۔ میں نے آہستہ سے نروپما کو جواب کہا۔  
ہم دونوں بہت دیر تک پہاڑی ندی کے کنارے کناٹے گھوما کئے۔  
اور جب میں اس سے رخصت ہونے لگا تو اس نے خوبصورت پھولوں کا ایک  
گلدستہ مجھے دیا۔ اس دن میں خلاف معمول دیر سے کیمپ میں ڈیپس لوٹا۔

جہاں ماچ کا مہینہ اپنے ساتھ تمام رعنائیاں لئے پھرواپس آیا۔ وہاں  
میرے لئے اس کی تمام دلچسپیاں سوہان روح تھیں۔  
میں نروپما سے جدا ہو رہا تھا۔ اور شاید پھر زندگی بھر اسے دوبارہ  
ملنے کا موقع نصیب نہ ہو سکیگا۔

روانگی سے دو روز پیشتر سب سامان وغیرہ بھیجا جا چکا تھا۔ شام کا  
وقت تھا۔ میں ایک درخت کے سایہ تلے گھاس پر لیٹا ہوا کسی گہرے خیالات میں  
گم تھا اور۔۔۔ سگریٹ کے دھوئیں میں انھیں بھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں نے حدافق پر نگاہ ڈالی۔ مجھے تمام ماحول۔ تمام کائنات۔ تھکی تھکی سی اُداس اُداس نظر آئی۔ میں بغیر کسی ارادے کے پہاڑی کی جانب چل دیا۔ میں نے دیکھا کہ نزدیکیاں میری راہ دیکھ رہی ہیں۔ اور اس کی گھنی پلکوں کی اوٹ سے آنسو جھانک رہے ہیں۔ گلاب ایسے چہرہ پر زردی چھائی ہوئی نہ جانے اسے کیسے معلوم ہو گیا تھا کہ میں اب اس سے جدا ہو رہا ہوں۔

روانگی سے پیشتر مجھ سے یہ بھی نہ ہو سکا کہ آخری بار اس سے مل لیتا۔ مجھ کو معلوم تھا کہ میں محبت کے جذبات سے منسوب ہو کر احساسِ فرض کو فراموش کر بیٹھوں گا۔ اب بھی شام کو جب فضا تاریک ہو جاتی ہے۔ اور اندھیرا گھنی جھاڑیوں اور درختوں پر اونگھنے لگتا ہے تو ناامیدی احساسِ جذبات پر طاری ہو جاتی ہے اور ہوا کی سرسراہٹ یہ کہتی ہوئی سنائی دیتی ہے۔

”کیا تم مجھے چھوڑ کر تو نہ جاؤ گے؟“

# چلتی پھرتی لاشیں

شاید آپ نے دیکھا ہوگا کہ بجلی کے کھمبوں پر ایک بورڈ لگا ہوتا ہے جس پر موٹے موٹے حروف میں لکھا ہوتا ہے ”خطرہ“

دو ہڈیوں کے درمیان ایک دل ہلا دینے والی کھوپری ہوتی ہے۔ انگلیں اندر کو دھنسی ہوئی اور سفید لمبے لمبے خوفناک دانت ایسے دکھائی دیتے ہیں جیسے وہ ابھی ابھی جسم کے کسی حصہ میں دبوست ہو کر رہ جائیں گے۔ بعینہ انکی یہی حالت تھی یایوں سمجھ لیجئے کہ آتش از جب کوئی ڈھانچہ تیار کرتے ہیں۔ تو بالمش کی پتلی پتلی قمیوں پر کاغذ سے منڈھ دیتے ہیں۔ بالکل اسی طرح اس مفلوک الحال اور فاقہ زدہ گروہ کی حالت تھی۔ جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ سا بن کر رہ گیا۔ اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں پچکے ہوئے زرد گال۔ لمبے لمبے سفید خوفناک دانت۔ رواں دواں بجلی کے کھمبے کا خطرہ۔ مجھے ہاتھ نہ لگاؤ۔ یہ زندگی اور موت کی کشاکش میں گرفتار غربت و در ماندگی اور فاقوں پر فاقوں کی کڑی سختیاں جھیلنے والے یہ جانتے ہوئے بھی کہ زندگی کا دیا چراغ مفلس کی طرح صرف چند لمحوں کا ہمان ہے۔ زندگی کو بچانے کی جدوجہد کر رہے تھے اور گروہ در گروہ ایک جگہ سے دوسری جگہ خوراک

کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے  
یہ انسانی فطرت ہے جس سے انحراف نہیں کیا جاسکتا۔ ہم زندگی میں موت  
کے متنی ہوتے ہیں۔ اور جب موت دروازہ پر آکر دستک دیتی ہے تو اسے کسی  
جیلے بہانے سے مٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔

بہت سے لوگ۔ انبوہ درانبوہ۔ گروہ درگروہ سڑکوں پر مارے مارے  
پھر رہے تھے۔ ننھے بچے بھوک سے بلبلاتے تجھیں مائیں بہلانے کی کوشش  
کرتیں۔ مگر وہ بھوک سے مجبور ہو کر زور زور سے چیختے اور چلاتے تھے۔

بے بس انسان آسمان کی طرف ایک نگاہ ڈالتے۔ آنکھوں میں آنسو بھرتے  
اور اپنی بے بسی پر آہ سرد بھر کر خاموش ہو جاتے۔

بعض تو رو بھی نہیں سکتے تھے۔ رونا اور گانا بھی تو خالی پیٹ نہیں ہو سکتا۔

یہ گزشتہ سال کی فردوسی کا ذکر ہے یہی کوئی آٹھ نو بجے کا وقت ہو گا۔  
بد قسمت انسانوں کا ایک گروہ سڑک کے کنارے بیٹھا تھا۔ ہر راہ گیر کی  
اسکی مرضی کے بغیر ان پر ایک اچھٹی سی نظر پڑتی۔ اور وہ تاسف کرتا ہوا گزر جاتا۔  
روز قیامت کے متعلق سنہ ہے کہ ہر شخص کو اپنی ہی دھن ہو گی۔ یہ شاید اسکی  
ایک چھوٹی ٹیسی جھلک تھی۔

میں فطرتاً حساس ہوں۔ اور یہ میری سب سے بڑی کمزوری ہے۔ اسی  
گروہ میں میں نے ایک جوان لڑکی دیکھی۔ جسکا خوبصورت چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔

خاموش گہری دیران دیران آنکھیں۔ کبھی کبھی نظریں۔ سانس درد کی ایک خاموش پکار۔

معاہیں نے سوچا کیا اسکا انجام بھی دردناک ہوگا؟ نہ جانے اُسے بیتے ہوئے دنوں میں محبت کے کتنے سنہری سپنے دیکھے ہوں گے۔ تالاب کے کنارے کیلے کے جھنڈوں میں ہم جولیوں کی سنگت میں  
”اے مسافر! تم یہ بھول نہ کرنا!  
یہ درد بھرا گیت گا کر دھڑکتے دل کو تسکین دی ہوگی۔

مگر اب آنکھوں میں بھوک تڑپ رہی ہے۔ اور ہونٹوں پر پیریاں جمی ہوئی ہیں۔ وہی ہونٹ جن پر کبھی مسکراہٹیں رقصاں ہوں گی۔  
یہ سوچ نہ تھی۔ اک اضطراب تھا۔ اس نے میرے احساس کی تلخی کو شدید سے شدید تر بنا دیا۔ اور مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی زور زور سے میرے سر میں ہتھوڑے کی ضربیں لگا رہا ہے۔ جیسے یہ بے نصیب لوگ برے وقت کی چٹول پر چوٹیں کھا رہے ہیں۔

ایکا ایکی میرے خیات نے پھر کر وٹ بدلی۔ اس جوان لڑکی کی زندگی بھی طلسم کی طرف اٹھتی چلی جا رہی ہے۔ اس کی زندگی کے رنگین خواب چمکا چور ہو گئے اور میری نظر دورد تک پھیلے ہوئے بے آب و گیاہ میدان تک چلی گئی۔

دنیا کی تمام سماجی اور دنیاوی بُرائیوں کی جڑ بھوک۔ ہے۔ یہ انسان کو

ہر رذیل سے رذیل کام کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اس کی شدت کے مقابلے میں مذہبی اور سماجی اصول بے بس سے ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس بُرے دنوں میں اگر ماؤں نے اپنے بچوں کو۔ خاوندوں نے اپنی عورتوں۔ باپ بھائیوں نے اپنے لڑکیوں اور بہنوں کو چند روپہی ٹیکسوں کے عوض اپنے آپ سے جدا کر دیا۔ وہ تو موثر و لازم نہیں۔ میرے دل نے کہا۔ کیا اس عُسرت زدہ لڑکی کو بھی —————  
ماں۔ باپ۔ بہن۔ بھائیوں اور دیس سے مُنہ موڑ کر اس نحیف و زار جسم کا سوا کرنا ہوگا۔؟

دل نے کہا ”نہیں نہیں۔“

یہ پھول وقت سے پہلے مڑ جھا کر شاخ سے گرنے نہ پائے۔

اور پھر سوچ! — ایک طویل سوچ!!

میری ذہنی کشمکش بتدریج بڑھتی چلی گئی۔ اور سر نیچا کئے۔ سوچتا سوچتا چلا گیا۔

چند روز بعد اتفاقاً میرے گزر پھر اسی راستہ سے ہوا۔ انسانوں۔ نہیں بلکہ چلتی پھرتی لاشوں کا ایک مختصر سا گروہ آہ و بکا میں مصروف تھا۔ اُن کی دلدوز چیخیں سنگدل سے سنگدل انسان کو بھی متاثر کئے بغیر نہ رہتی تھیں۔  
جذبہ ہمدردی مجھے بھی کشاں کشاں اس جانب لے گیا۔  
وہی زرد چہرہ۔۔۔ بکلی کے کھمبہ کا خطرہ! ابدی نیند سوچکا تھا۔

بانغ جناں کا اک پھول — بادِ حوادث کے تند تھپیڑے برداشت نہ کر سکا۔ اور آخر کار خاک میں مل گیا۔

جب کبھی وہ سماں آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے تو میں اپنے آپ کو نفریں کرتا ہوں۔

بزدل۔ ڈرپوک۔ تو سب کچھ جانتے ہوئے بھی نہ جان سکا۔  
اک "پھول" وقت سے پہلے اپنی تلخ سے گرا اور خاک میں مل گیا۔

---

# ادیب کی موت

انیل بابو نے کتابوں کے انبار میں سے فوٹو کولر لاپرواہی سے پرے پھینک دیا۔

”تم اسے اس طرح بے پروا ہو کر کیوں پھینک رہے ہو؟“ انیل کی بیوی پر دتتا نے کہا۔

”ذرا دیکھئے تو دو۔“  
 ”تم اسے دیکھ کر کیا کرو گی؟ اگر میں نے اسے یوں پھینک دیا ہے تو آخر کچھ سوچ کر ہی کیا ہے؟“ انیل بابو نے جواباً کہا۔ اور پر دتتا یہ سن کر خاموش ہو گئی۔

---

کتنے ہی مہینوں سے وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیکار بیٹھا تھا۔ گھر کا تمام اثاثہ اور فرنیچر ایک ایک کر کے فروخت ہو چکا تھا۔ اب کتابوں کی باری آگئی تھی۔ علاوہ بریں بیوی کی بیماری اور پانچ سالہ بچے کی دیگر گوں حالت نے اس کی پریشانیوں میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا۔

پروتما نے نوٹو کو پکڑ کر دیکھنا شروع کر دیا۔ یہ ایک خوبصورت لڑکی کی تھی۔

”یہ لڑکی کون ہے؟“ گرانیل بابو نے سُنا ان سُنا کر دیا۔ کیونکہ اُسکا داغ اس اُدھیڑ بُن میں مصروف تھا کہ کس کتاب کو رکھے اور کسے فروخت کر دے۔ مگر اب ان باتوں کو سوچنے کی مہلت کہاں۔ اب تو وہ اک گنگنام سا شخص تھا۔ کبھی زمانہ تھا جب لوگ اس کی کتابوں کے مشتاق تھے۔ اور وہ ملک کے چوٹی کے ادیبوں میں شمار ہوتا تھا۔ اب تو یہ کتابیں ردی کے بھاؤ بکلیں گی۔ وہ ادبی موت مر چکا تھا۔ اور ایک ادیب کے لئے اس سے زیادہ اور کوئی روحانی تکلیف نہیں۔

”کیا آپ یہ تمام کتابیں رکھیں گے؟“ پروتما نے پوچھا۔  
 ”ہاں! ان میں سے کچھ کتابیں ایسی ہیں جو مجھے جان سے زیادہ عزیز ہیں میں انھیں جُدا کرنا نہیں چاہتا۔ جب کسی کتاب کو دیکھتا ہوں تو مجھے گزشتہ دنوں کی یاد آتی ہے۔“

یہ لڑکی کون ہے؟“ پروتما نے قدرے توقف کے بعد دریافت کیا۔  
 وہ اس سوال پر جھلٹا سا گیا۔ ”تمہیں اس کے متعلق اتنی تشویش کیوں ہو؟  
 مگر تم پوچھے بغیر نہ رہ سکو گے۔ یہ آج سے بہت سال پہلے کی بات ہے مجھے اس لڑکی سے محبت تھی۔ اور وہ بھی مجھے پیار کرتی تھی۔ میں نے اس سے شادی

کر لی ہوتی — مگر مجھے اب خوشی ہے کہ میں ایسا نہ کر سکا۔  
 ”اگر آپ نے اس سے بیاہ کر لیا ہوتا۔ تو آج اس بیدردی سے اس کی  
 فوٹو کو نہ پھینکتے“ اور ائیل بابو بغیر جواب دیئے کچھ سوچنے لگا۔ شاید وہ اپنی  
 محبت اور جیتے دنوں کو یاد کر رہا تھا۔

پانچ سالہ سرشیش کے قدموں کی چاپ نے اس کے خیالات کا شیرازہ بکھر دیا۔  
 ”بابو جی!“ — ”نہنھے جاؤ باہر کھیلو۔ مجھے پریشان نہ کرو  
 مگر سچہ وہیں فرش پر بیٹھ گیا۔ اور نظیروں کے شوق میں کتابوں کی ورق  
 گردانی کرنے لگا۔

پھر یکایک بول اُٹھا: ”کیا آپ انھیں سچائیں گے بابو جی؟“  
 ”نہیں! اس بھوٹے سے کمرے میں اتنی جگہ کہاں؟“  
 ”تو پھر ہم اس جھوٹے سے کمرہ کو چھوڑ کر بڑا سا گھر کیوں نہیں لیتے؟“  
 ”تھوڑے دنوں کے بعد ہم نئے مکان میں رہیں گے جس میں ایک باغیچہ  
 بھی ہوگا۔ اور سرشیش کے لئے جھولا بھی ڈالیں گے۔

”بابو جی — آپ تو ہر بات پر کہتے ہیں۔ تھوڑے دنوں کے بعد...  
 ... تمہیں نئے کپڑے بنوا کر دیں گے کھلونے خرید کر دیں گے۔ مگر اب  
 کیوں نہیں؟“ اور ائیل بابو نے بغیر سوچے سمجھے کہا: ”ہم غریب ہیں۔“  
 ”ہم غریب ہیں۔ تو میں بھی کسی چیز کے لئے ضد نہیں کروں گا۔“

پانچ سالہ بچہ کی ریبات سُکر انیل بابو کے دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ اور اُس نے اپنے آنسوؤں کو بصدِ کل ضبط کیا۔

جاؤ کھیلو۔ میرے بیٹے — اور وہ پھر کتابوں کو علیحدہ کرنے میں مشغول ہو گیا —

انیل بابو دن بھر تین چار کتابوں کے مسودے لُٹل میں دبائے پلشٹروں کی دکانوں پر مارا مارا پھرا۔ مگر کہیں بھی اس کو شعاعِ اُمید کی جھلک تک نظر نہ آئی۔ دو ایک پلشٹروں نے تو خوفناک حد تک صداقت بیانی کا اظہار کیا۔

”آپ کی کتابیں آج کل مقبول نہیں۔ اس ہولناک گرائی کے زمانہ میں جبکہ کاغذ کا دستیاب ہونا۔ جوئے شیر کے لانے سے کم نہیں! انھیں چھاپنا حماقت ہے ایک اور پلشٹر نے کہا کہ آپ مسودات رکھ جائیں۔ ہم اپنے ادارہ تدوین کو دکھائیں گے۔ اگر اُن کے معیار پر پورا اُترا تو آپ کو معقول معاوضہ دیا جائیگا۔

مگر انیل بابو اس پر رضامند نہ ہوا۔ اُسے تو فوری روپے کی ضرورت تھی اور یہاں ایک ہفتہ کی تارتخ۔

وہ آہستہ آہستہ قدم اُٹھائے گھر کی طرف آ رہا تھا۔ جیسے کوئی طالب علم امتحان میں فیل ہو کر آتا ہے۔ یکایک اسے ایک خیال سوچا اور خوشی کی ایک لہر اس کے تمام بدن میں دوڑ گئی۔

”میری وجہ سے ہی بیوی اور معصوم بچہ بھوک اور فاقہ کی تکلیفیں برداشت کر رہے ہیں۔ اگر میں ان کے لئے اپنی جان کی قربانی دیدوں تو اُن کی زندگی کے

بڑی آسانی سے بسر ہو سکتے ہیں۔

دو برس گذرے۔ میں اپنی زندگی کا بمیہ بیس ہزار روپیہ میں کرایا تھا پچلی سڑھی تک میں باقاعدہ اس کی اقساط ادا کرتا رہا ہوں۔ یہ سوچتا ہوں۔ وہ ایک کمیٹ کی کان پر پہنچا۔ اور دوائی کی ایک پڑیا خرید کر کے جیب میں ڈالی۔

گھر میں داخل ہوتے ہی پروتھانے پوچھا  
 "کیوں کہیں کام بنا" نہیں۔ مگر امید ہے کہ تین چار روز کے اندر سب تکلیفیں  
 دور ہو جائیں گی۔ انیل بابو نے مسکراتے مسکراتے جواب دیا۔  
 اس کی مسکراہٹ کو دیکھ کر پروتھانکو بھی یقین ہو گیا کہ ان کی تکلیف کے ایام  
 جلد ہی دور ہو جائیں گے۔ رات کو سونے سے پہلے انیل بابو نے سریش اور بیوی  
 سے بہت دیر تک باتیں کیں۔  
 مگر دوسری صبح وہ بیدار نہ ہو سکا۔

# اُس کی تمنا

دینا نگر کی دور دیہ آموں کی سڑک پر وہ سڑھکاے آہستہ آہستہ جا رہا تھا۔  
 پھاگن کے مہینہ کے آخری دن تھے۔ ارد گرد کے کھیتوں میں سرسوں کے پیلے پیلے  
 پھول ہوا کے دھیمے دھیمے جھونکوں میں جھولا جھول رہے تھے۔ آموں پر مورا یا  
 تھا۔ اور پٹروں پر دیوانی کوئل کو کوئل کی دلسوز کوک میں غمِ فرقت کے نغمے الاپ  
 رہی تھی۔

اسی سڑک پر ایک بیل گاڑی میں عورتیں رنگ رنگ کے دوپٹے پہنے سوار  
 تھیں کبھی کبھی ہوا کے تیز جھونکے سے کسی الٹرز دیشیزہ کی اوٹھنی کا آنچل ہوا میں اڑتا  
 تو فضا میں کئی نفرنی قمقمے بکھر جاتے۔ گاڑی بان بھی اک بانکا سمیلا نوجوان تھا۔  
 اور غیر معمولی طور پر بھر پیلے لباس میں ملبوس۔ دلفریب اور خوش کن ترنم کے ساتھ  
 ماہی کے پٹے الاپتا ہوا۔ سیلوں کو تیز تیز بانکے لئے جا رہا تھا۔

اُس کی آواز کا اتار چڑھاؤ اور سیلوں کی گھنٹیوں کی سُرلی آواز ہم آہنگ  
 ہو کر اک ملکوئی نغمہ پیدا کر رہی تھیں۔

اس بیل گاڑی سے چند قدم کے فاصلے پر دو نوجوان آپس میں گفتگو کرتے

ہوئے جارہے تھے۔ جب وہ گاڑی میں سے لہرتے ہوئے دوپٹے دیکھتے۔ تو  
چہقہے لگاتے۔ اور یہ آواز فضا میں ارتعاش پیدا کرتی۔

لیکن وہ — ان دونوں سے علیحدہ خیالات کے سمندر میں غوطہ زن  
آہستہ آہستہ سر جھکائے جا رہا تھا۔ اس کی چال عام رفتار سے بھی قدرے سُست  
تھی۔

کیا زیمو بھی میلہ میں آئے گی؟ اور اگر وہ نہ آئی تو۔۔۔

اسی سوچ نے اُسے ارد گرد کے ماحول سے بھی بے نیاز کر دیا تھا۔ وہ دل  
ہی دل میں سوچنے لگتا۔ نورہی۔ طالعہ۔ اور حشمت اس کی سہیلیاں آئیں تو اسے  
بھی زبردستی اپنے ساتھ کھینچ لائیں گی۔

زیمو اور اس کی محبت کی داستان۔ گاؤں کی ایک سیدھی سادھی رومانی  
داستان تھی۔ ایک شام کو جب وہ شہر سے اپنے گاؤں کی طرف لوٹ رہا تھا۔  
تو اُسے سوچا کہ اپنے دوست خوشیا کو ہی ملتا جائے۔

اسی خیال کے پیش نظر اس نے کچی سڑک کو چھوڑ کر گاؤں کی طرف جانے  
والی پگنڈی کا رخ کیا۔ زیمو کنویں پر پانی بھر رہی تھی۔ بکھرتا ہوا شباب۔ متوالی آنکھیں۔  
بُٹا سا قد۔ وہ قدرے ٹھنکا۔ دونوں کی نگاہوں کا تصادم ہوا۔ زیمو جلدی جلدی  
سر کی اوڑھنی درست کرنا شروع کی۔ اور وہ دل میں دردِ محبت کی ایک ٹپکی ٹپکی کسک  
لئے خوشیا کے گھر کی جانب چلا گیا۔ اُن دونوں کی محبت اُس وقت پروان چڑھی

جب وہ خوشیا کی مدد کے لئے گئیوں کی نسل کاٹنے زیو کے گاؤں پریم نگر میں آیا۔

جیٹھ کی چلچلائی دھوپ میں پسینہ میں شرابور کان چھوٹے چھوٹے گردوں میں بٹے ہوئے تھے۔ اُن کی تیز تیز درستی کی سٹریٹ سٹریٹ کی آواز۔ بچوں اور عورتوں کا پولیاں جمع کرتے دقت شور و غوغا۔ اور اسی دوران میں کسانوں کا چھاپھ کے لئے بے قرار ہونا عجیب سماں تھا۔

زیو چھاپھ پلانے پر مائل ہوئی۔ جوانی کے نشہ میں مست۔ دل میں محبت کے خواب۔ چھاپھ پیتے وقت وہ جان بوجھ کر تاخیر کرتا۔ نہ جانے یہی چھاپھ اس کے لئے کیا بن جاتی — بیچارے کسان۔ امرت اورے دینا کے تصور سے بھی آشنا نہیں۔ تو اس کے ساتھی چلاتے۔ ارے کیا تمام چھاپھ تم ہی پی جاؤ؟ ایک دن اس نے ادھر ادھر دیکھ کر یاس و امید کے بٹے جیسے جذبات میں سہمے سہمے زیو کی کلائی پر ہلکی سی چٹکی لی۔ تو زیو نے مسکراتے ہوئے کہا جب میں نے چٹکی بھری تو مضبوط کلائی کا خون جم کر رہ جائیگا۔ تو اس نے اپنا مضبوط ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ زیو کا ہاتھ لگتے ہی اس کے بدن میں اک جھرجھری سی پیدا ہوئی۔

سنے میں کسی نے دُور سے پکارا۔ ارے زیو چھاپھ تو پلا۔ پیاس سے دم نکل رہا ہے۔ وہ مسکراتی مسکراتی اک نیکا غلط انداز ڈال کر جلدی جلدی قدم اٹھاتی چلی گئی

یہ تھی ابتداءِ محبت۔ پھر اس کے بعد اندھیری راتوں میں بورے جہان کے گھمنے اور تاریک سایہ میں اُن دونوں کے درمیان محبت کے قول و قرار ہوئے۔

اس کے بعد وہ کبھی کبھی "پریم نگر" میں جاتا اور دُور ہی سے زیو کو دیکھ کر دل کو ایسے تسکین دیتا۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی اچھوت۔ مقدس دیوتا کے درشن کر کے اپنی بے پایاں عقیدت و محبت کا اظہار کرتا ہے۔

دیہاتی محبت پارکوں اور سینماؤں میں رُسا نہیں ہوتی۔ پری سیئنے میں محبت کی آگ دبائے رکھتے ہیں۔ مگر عموماً یہ آگ اُسوقت شعلہ جوالہ بن جاتی ہے جب کوئی بوڑھا زمیندار یا نمبردار اپنی زمین اور روپیہ کے بل بوتہ پر دیہات کی اُتھر دیشیزہ کو اس طرح لے جاتا ہے۔ جیسے بھوکا شکاری باز اپنی ایک جھپٹ سے ننھی سی چڑیا کو اپنے پنجوں میں دبوچ کر پہنائے آسانی میں گم ہو جاتا ہے۔

زیو نے وعدہ کیا تھا۔ کہ وہ اسے بڑے پیر صاحب کے مید پر ملے گی۔ اسی دُھن میں وہ سوچتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ اس کے دل میں کتنی ہی تمنائیں اور آرزوئیں کروٹیں لے رہی تھیں۔ وہ زیو کو بوڑھے منہاری والے کی گمان سے بہت ہی خوبصورت چوڑیاں۔ ریشمی رومال اور چاندی کے بکریکر دیگا۔ جو ہر سال میلہ پر عورتوں کی دل پسند چیزیں لاتا ہے۔ وہ لاکھ کھتی ہے۔

نہیں! نہیں!! درکار نہیں۔ مگر وہ اس کی ایک بھی نہ سنے گا۔

میلہ کے شور و شغب کی آوازیں دُور دُور سے سُنائی دے رہی تھیں۔ اور جوں جوں یہ آواز نزدیک سُنائی دیتی تھی، اُسکے قدموں میں بھی پھرتی آتی جاتی تھی۔

میدان میں ایک طرف ملاری کے گرد بہت سے لوگ جمع تھے۔ وہ اپنے کمالات فن کا مظاہرہ کر کے سادہ لوح دیہاتیوں کو محو حیرت کر رہا تھا۔ اُس سے تھوڑے فاصلہ پر ایک بوڑھا کسان اکنارے پر ڈھول شہزادہ کی عشق و محبت کی داستان سنا رہا تھا۔

فضا بنا سیتی اور تیل کی مٹھائیوں کی سڑاند سے بسی ہوئی تھی۔ اس نے ابھی بمشکل میلہ کے پڑاؤ میں قدم ہی دھرا تھا کہ سپاہی کی رعونت بھری آواز نے اُسے وہیں کھڑا ہونے پر مجبور کر دیا۔

”میرے ساتھ چلو۔“

”کہاں؟“

”اسٹیشن پر۔“

ڈپٹی صاحب دورہ پر آئے ہیں۔ ان کا سامان اسٹیشن سے لانا ہو گا۔ اور اسکے ساتھ ہی سپاہی نے دبی دبی زبان میں ڈپٹی صاحب اور اسکے سارے خاندان کو صلو اتیں سُنا دیں۔ جس کی آمد کی وجہ سے میلہ کا لطف جاتا رہا۔ اور

اک ناقابل بیان خسارہ برواشت کرنا پڑا۔ اُس نے سپاہی کی ہزار ہزار منتیں کیں کہ وہ کسی دوسرے آدمی کو بیگار میں لے جائے۔ مگر اس کی تمام التجائیں بیگانہ گئیں۔ پینلی اور سرخ پگڑی والے — بڑے سنگدل ہوتے ہیں۔

بانجے سچیلے نوجوان — اپنے گھوڑوں کو ایڑیاں لگاتے ہوئے گھوڑ دوڑ کے میدان کی جانب لے جا رہے تھے۔ سال بھر کے بعد تو نمائش کا یہ موقع ہاتھ آتا ہے۔ اور ہر ایک اپنی اپنی بساط کے مطابق دوسرے کو شکست دینے کے لئے کوشاں تھا۔

ہر ایک گھوڑے کے گلے میں چاندی کی حائل جھلیل جھلیل کر رہی تھی۔ وہ انھیں دیکھتا ہوا سوچ رہا تھا کہ دس میل کے فاصلہ سے سامان لا کر تب اس کی خلاصی ہوگی

ایکا ایکی بڑے تو نندوانے سراپاٹ بال تھانیدار کی بھلی کی طرح کڑکتی ہوئی آواز نے اس کے خیالات کا تمام سلسلہ درہم برہم کر دیا۔ ”بدماش“ ابھی تک کھڑا کیا سوچ رہا ہے۔ اور آنا فانا اُن موٹی موٹی ٹکالیوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ اور دوسرے لمحہ میں تڑاق تڑاق بید کی ضربوں کی بارش شروع ہو گئی۔

”مجھے جانتے نہیں“

”میرا نام سن کر بڑے بڑے بد معاش تھڑا اٹھتے ہیں“ تھا نیدار صاحب نے اپنی لمبی لمبی مونچھوں پر ناؤ دیتے ہوئے بڑے فخر یہ انداز میں کہا۔ تاکہ ارد گرد کے لوگ شکر مرعوب ہو جائیں۔

وہ فریاد مجسم۔ سہمے اور سسکتے ہوئے ارمان لئے، دوسرے بیگاریوں والوں کے ساتھ بید کی مار کے نیلے نیلے نشانوں کو سہلانا ہوا۔ سر جھکائے سپاہی کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ میلہ کی گھاگھی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ شور و غل کی آوازیں بدستور سنائی دے رہی تھیں۔ مداری اپنے کرتب دکھانے اور بوڑھا ڈھول شہزادہ کی رومانی داستان سنانے میں مصروف تھے۔

ایک بار اس نے آسمان کی طرف دیکھا ایک طویل سرو آہ بھری۔ آہ۔۔۔ اس کی تمام تمنائیں اور حسرتیں دم گھٹ کر رہ گئیں۔

# کھڑکی میں سے

”بچھی اڑ گیا!“

نیاز نے مسکراتے مسکراتے کہا

”کب؟“ میں نے حیرانگی سے پوچھا۔

”کل رات کو۔“

”اور تمہیں کیسے معلوم ہوا“ کھڑکی جو صبح سے بند ہے۔ تم بھی شریک ہو مزا  
ثانی ہو۔ بھلا یہ بھی کوئی وجہ قرار دی جاسکتی ہے۔ میں نے طنز سے کہا۔

”میری بات کا یقین کرو۔ کشوری ابھی ابھی مٹہ بسورتا ہوا آیا تھا کہ اُس کی نئی

نوبلی دُہن موہنی کل رات سے غائب ہو۔“ نیاز نے کہا۔

اتنا اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔ اُسی نند و لونڈے کے ساتھ رفوچکر ہو گئی ہوگی

جو گذشتہ چند دنوں سے بال سنوار کر بھوزے کی طرح کھڑکی کے ارد گرد منڈلایا

کرتا تھا۔

مجھے سچا بے کشوری کی حالت پر افسوس بھی تھا اور مسرت بھی۔ افسوس اس لئے کہ وہ پھر

اکیلے کاکیلا ہی رہ گیا۔ اور مسرت اس بات پر کہ میری پیشین گوئی پوری ہو گئی۔

لوٹ پیا کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر میں نے نیاز سے کہا تھا کہ یہ چند دنوں تک فرار ہو جائے گی جس کی تعبیر پوری ہو گئی تھی۔

میرے دفتر کے سامنے ایک بنگلہ ہے جس میں اینگلو انڈین لوگ اقامت پذیر ہیں۔ اُسکے باورچی خانہ کی ایک کھر کی دفتر کی جانب کھلتی ہے۔ اور کشوری اسی بنگلہ میں باورچی کا کام کرتا ہے۔

تین سال سے دفتر کی اُسی دیمک خوردہ کرسی پر ڈٹا ہوا ہوں۔ وہی پرانی میز اور اُسپر گرد و غبار سے لٹی ہوئی ڈیز ڈیزر فائیں۔ وہی دفتر اور وہی بنگلہ۔ نرسٹیک کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ ماسوائے اس کھر کی کے جو کھر کی پہلے کبھی کبھار کھلتی تھی اب دن بھر کھلی رہتی تھی۔ اور د جانے باورچی کے ملنے والے حضرات الارض کی طرح کہاں سے پیدا ہو گئے۔ دن بھر ملنے والوں کا آگ سلسلہ جاری رہتا۔ کہ اس میں رات کے دس بجے تک بھی کمی واقع نہ ہوتی۔ اور اسکا باعث تھی موتی —

موتی جب سے اس کی زندگی میں داخل ہوئی تھی۔ اس کی دنیا ہی بدل گئی تھی وہ خاموش خاموش چہرہ جس پر کبھی مسکراہٹ کی جھلک بھی نہ دکھی گئی تھی۔ اب سرت کام کر رہا تھا۔

باورچی خانہ جس کی تمام تر زیب و زینت ایک چٹائی تھی۔ اس کی جگہ اب کھاٹ نے لے لی تھی۔

موتی کوئی اتنی حسین تو نہ تھی۔ مگر پھر بھی جوانی — جوانی ہے۔ اُسکا گداز

کھڑکی میں سے

۲۵۳

بکھرے ہوئے تارے

جسم کھلتا ہوا رنگ - تیز و طرار آنکھیں - پتلے پتلے ہونٹ جن پر ہر وقت سُرخ کی ایک تہہ جمی رہتی -

یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں کہ اگر چند دل پھینک موتی کو دیکھیں اور پھر انکے حلقہ میں چہ میگوئیاں نہ ہوں -

مقامی سینما میں مبئی ٹائیکز کی مشہور فلم ”قسمت“ ریلیز ہوئی تھی - اور اسی شام کو میں نے دیکھا کہ موتی بھی ہلکے زرد رنگ کی ساڑھی پہنے عندلیب پر بہار گلشن جوانی کی طرح چمکتی ہوئی کشوری کے ہمراہ خراماں خراماں جا رہی تھی - اور راہ چلتے نوجوان — آنکھیں سینک رہے تھے -

مبھد میں ابھی دفتر میں آکر بیٹھا ہی تھا کہ ”قسمت“ کا گیت ع  
”گھر گھر میں دیوالی ہو مرے گھر میں اندھیرا“  
کی آواز سنائی دی - کھلی کھڑکی میں سے میں نے دیکھا - موتی مست ناگن کی طرح  
لہر لہر کر گارہی تھی کشوری پر آگ کیف سا طاری تھا - آخر اس نے اپنی آغوش میں  
لیکر لبوں پر محبت کی مہر ثبت کر دی لیکن اس دن کے بعد وہ کچھ بڑا مردہ سا رہنے  
لگا - شاید اُسے موتی کی پہاڑی ندی کی طرح چڑھتی جوانی اور اپنے اُترتے  
ہوئے شباب کا احساس ہو گیا تھا -

ادھر نندو نے بھی جیلے پہانے کر کے کھڑکی کے سامنے سے گزرا شروع

کر دیا۔ پھر آہستہ آہستہ دونوں جانب سے اشارے و کنائے شروع ہو گئے۔  
ان ہی آثار و قرائن سے میں نے نیاز سے کہا تھا کہ اب بچھی زیادہ دیر تک  
بجھرہ میں قید نہیں رہ سکتا۔

فراری سے ایک دن پیشتر موتیٰ ایک فلمی گانا گا رہی تھی تو میں نے نیاز  
سے کہا۔ اب فتن کی تیلیاں ٹوٹنا ہی چاہتی ہیں۔ وہ گانا یہ تھا۔  
اک تو ہو۔ اک میں ہوں۔ اور ندی کا کنارہ ہو

سماں پیارا پیارا ہو

دل کی بات لبوں پر آئی اور کہی نہ جائے۔

آنکھوں کا اسارا ہو اور کوئی نہ چارہ ہو

اس کے دوسرے دن بچھی بجھرہ سے اڑ چکا تھا۔

# رہ گزریا د

کشور مڑھائے ہوئے پھول پتیوں پر اشکباری کر رہا تھا۔  
 نگاہیں اتنی محو کہ پتیوں میں گڑ کر رہ گئیں۔ یہ توصات ظاہر تھا کہ اس کی نگاہیں  
 ان خشک پتیوں کو ہر انہیں سکتیں

کہ میں یکایک کمرہ میں داخل ہو گیا۔  
 کشور میرے بہترین دوستوں میں سے تھا۔ کچھ دن ہوئے وہ موسم گرما  
 کی چھٹیاں گزار کر آیا تھا۔ آمد کے دن ہی سے اس کی طبیعت میں بڑی حد تک  
 سنجیدگی پیدا ہو گئی تھی۔ سینا کھب اور کرکٹ کے پروگرام خواب و خیال ہو چکے  
 تھے۔

میرا خیال تھا کہ عرصہ طویل کے بعد اڑھائی تین ماہ بہن بھائیوں میں گزار  
 کر آیا ہے اس لئے طبیعت ادا ہے۔ چند دنوں کے بعد کالج کے دلچسپ  
 سنگاموں میں دل بہل جائیگا۔ مگر یہ سب خیال غلط نکلے۔ اور جبکہ میں اس کے  
 کمرہ میں ایک دم جا گھسا۔ اور اسے اس طرح پھول پر اشکباری کرتے ہوئے

دیکھا تو حیران و ششدر سا رہ گیا۔ اُسے مطلق خبر نہ ہوئی کہ میں کتنی دیر سے اس کے کمرہ میں ہوں۔ میں نے اُسکے کندھے پر آہستہ سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔  
کشور! تم!

ہاں۔

تم رو کیوں رہے ہو؟

یوں ہی

آخر کوئی وجہ؟

جب رونا ہی ودیعت ہو چکا تو پھر دل کی ہوس کیوں رہ جائے۔  
یہ پھول ادھر دو تو۔!

”نہیں! یہ برباد محبت کی نشانی ہے۔“

آنکھوں سے آنسو پوچھتے ہوئے۔ گہرا سانس لیکر وہ یوں گویا ہوا۔ تمہیں تو معلوم ہے کہ والد صاحب کا خط آیا تھا جس میں تعطیلات کے دنوں میں رات گھر چلے آنے کی تاکید کی گئی تھی۔ اس کے بعد اُسے نقصوات میں کھو کر گزری ہوئی داستان کا نقشہ کھینچ کر میرے سامنے رکھ دیا۔ اور سرزمین کشمیر کا ماحول میرے دل و دماغ میں برسم ہو گیا۔

دو طرفہ سفیدے کے درختوں میں ہوتی ہوئی سڑک بڑی بڑی پہاڑیوں کے گرد چکر کاٹتی ہوئی ایک پہاڑ کے نیچے گم ہو گئی تھی۔ یہیں سے ایک بگڑنڈی ناگن کی طرح بن کھاتی ہوئی بسنی تک پہنچتی تھی۔ نیچے بہت گہری گہری کھڈیں

تھیں جنہیں دیکھ کر ذہنت سی طاری ہو جاتی تھی۔ کالے کالے بادلوں کے گائے دھوئیں کی طرح پہاڑوں کے بیچ سے سر اٹھاتے ہوئے آہستہ آہستہ دھند وغبار سا بن کر اُنہیں میں سما جاتے۔ آسمانی نضا نہایت دلکش ہو گئی تھی۔ بادلوں کی اوٹ سے کبھی کبھی سورج شرمیلی دُہن کی طرح جھانک لیتا تھا۔ ہری ہری دُوب کی سوندھی سوندھی خوشبو۔ جنگلی چڑیوں کے گیت اور کبھی کبھی کسی چھوٹے پرند کی سوز سے بھری ہوئی چیخ روئیں روئیں میں انبساط و سرود کی لہر پیدا کر دیتی۔ بھلاؤں کے نیچے ترائی میں چھوٹے چھوٹے پتھر کے مکان گڑیوں کے گھر کی طرح دکھائی دیتے تھے۔ چلتے چلتے وہ چشمہ کے کنارے پہنچا۔ یہاں گاؤں کا ایک ریوڑ چر رہا تھا چشمہ میں کنول۔ کے پھولوں کے درمیان ایک بیباک چرواہا نہ رہا تھی۔ گورا گورا گدرا جسم گویا یونانی صنّاعی کامر میں مجسمہ جب وہ پانی میں غوطہ لگا کر سینہ آب پر ابھرتی تو لمبے لمبے بالوں سے پانی کے قطرے شبنم کے قطروں کی طرح کنول کے پتوں پر سے کھسکتے ہوئے پانی میں جا ملتے۔ ہری ہری دُوب اور جنگلی گلاب کی خوشبو اسکے دماغ کو معطر کئے جا رہی تھی اور وہ نصورات کی دنیا میں کھو گیا۔ ایک ایک گھوڑے کی باگ تھامے ہونے نوکرنے کہا۔

”بابو جی! اب بنگلہ قریب ہی ہے۔“

”آپ سامنے چشمہ پر ہاتھ مٹھنا صاف کر لیجئے۔ چہرہ کھلا سا گیا ہے۔“ یہ روکھے سے الفاظ اُسکے نصورات میں خلل انداز ہو رہے تھے۔ وہ چشمہ کے قریب پہنچا۔ اسکے کھوئے ہوئے نصورات پھر سے مل گئے۔

پتھر میں چوڑے چوڑے اور بڑے بڑے پتھوں کے بیچ ہزاروں کنول کھلے ہوئے تھے۔ شام کی شفق کا عکس پانی پر سونے کی تہہ معلوم دیتی تھی۔ شگفتہ کنول سنہری مرغابیوں کی طرح ہلکی ہلکی ہوا کے بار سے سطح آب پر جھک رہے تھے۔ ان کے درمیان وہ بھی ابک کنول کے مانند تھی۔ بھیگے ہوئے بالوں پر سے سرکتے ہوئے پانی کے قطرے شام کی لالی میں رنگے گئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے اس کے بالوں میں ہیرے جواہرات جڑ دیئے ہیں۔ یا آکاش سے تارے توڑ کر ان کے بالوں میں اٹکا دیئے ہیں۔ اسنے اپنی غریباں بانہوں کو پانی پر پیراتے ہوئے اس کی طرف دُردیدہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ ہی کشورِ بالو ہیں نا؟“

”ہاں۔ میں نے تمہیں کہیں دیکھا ہے۔“

”مجھے۔ ہاں!“

”یاد کر لیجئے۔ شاید اسی چشمے پر۔“

”کچھ یاد نہیں۔ مدت کی بات ہے۔“

”میں یاد کرانے دیتی ہوں۔ جب آپ اسکول سے بھاگ کر آئی چشمہ پر آکر

پناہ لیا کرتے تھے۔ لو کہ بھی کبھی میری بھینروں کو کھیتوں میں جانے سے روک دیا کرتے تھے۔“

”او۔ یاد آگیا۔ تم رجنی ہو۔ اب تو تم بہت بڑی ہو گئی ہو۔“

”میں تو بھول ہی گیا تھا۔“

”میں تو نہیں بھولی بابو — سچ ہے۔ امیر لوگ بھول جانے کے عادی ہیں“  
 ”نہیں — ایسا نہ کہو۔“

اور اس کے دماغ میں گزریے بچپن کی یاد تازہ ہو گئی۔  
 جاؤ۔ ہم نہیں بولیں گے تم سے۔ تم روز راجہ رانی کا کھیل کھیلنے کو کہتے ہو۔ مگر  
 کھیلتے بھی ہو؟

راجہ کون بنے گا — ”تم“ اور ”رانی“ ہم۔  
 دیکھو۔ یہ ہمارا محل ہے چشے کی گیلی مٹی اور ریت سے بنا ہوا

”اب تو بہت پڑھ گئے ہو گے بابو۔ بہت بڑی نوکری ملے گی۔“  
 ”کچھ نہیں۔“ اس نے سال خوردہ پتھر پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ جس پر  
 بڑے بڑے دھندلے حروف ہیں اب بھی رجنی رانی کھدا ہوا تھا۔  
 ”بابو — تم اُداس ہو گئے ہو۔ وہ بچپن تھا۔ اور اب زندگی کی دوسری  
 منزل ہے بچپن اور اس کی باتیں گئی گزری ہو چکیں  
 تم یہ ہلکی ہلکی باتیں کیوں کر رہی ہو۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہئے۔ کہ سالوں کے  
 بچھڑے پھر سے مل گئے ہیں۔“

میں خوش ہوں۔ اسی دن سے جس دن ننھے ننھوں نے بچوں میں کھیلتے کھیلتے  
 تمہارے آنیکا ذکر کیا۔ میری خوشی کی کوئی حد نہ رہی اور اس دن تک تمہاری  
 منتظر رہی ہفتہ بھر سے بھیرڑوں کو چشے کے دوسرے کنارے بھی نہیں لیکر گئی۔

”تم آگے۔ میری خوشی کی کوئی حد نہ رہی۔  
 ”کشور بابو۔ کشور بابو۔“ فکرنے چلاتے ہوئے کہا۔ ”جلدی کیجئے۔“  
 اُس نے جلدی جلدی لڑلیہ سے منہ صاف کرتے ہوئے —————  
 رجنی سے کہا۔

”سُتو۔ رجنی نے پانی کی سطح کو چیرتے ہوئے باہر قدم رکھا۔ گیلے  
 بالوں کو اس ادا سے جھٹکا دیا کہ ہزاروں ناگنوں کا زہر کشور کی رگ رگ میں سہا گیا۔  
 اُس کے خشت گیلے لباس میں جسم کا تمام آثار چڑھاؤ صاف دکھائی دیتا تھا۔ وہ  
 اکے نزدیک تن کر کھڑی ہو گئی۔ جیسے فردوس بریں کی بخود خور جوانی کی آب حیات  
 میں نہا کر آئی ہو۔

اُس کی نس نس میں بجلی کی لہر دوڑ گئی۔ جیسے ہزاروں شراب کے جام اسیر  
 اُبھیل دیئے گئے ہوں۔ نزدیک ہی جنگلی گلاب کھلا ہوا تھا۔ نازک و نرم ہاتھ اُسی  
 طرف پکے۔ اور دوسرے لمحے گلاب کا نتھا سا پھول پتی پتی بسی بسی انگلیوں کے دریا  
 تھا۔

”آہستہ سے اُسے کشور کے کوٹ کی کار میں اسکاٹے ہوئے کہا۔  
 ”پھر نہ جانے کب ملاقات ہوگی۔ کل تو میکے چلی جاؤں گی!“  
 کشور کا تمام نشہ اُتر گیا جیسے کسی نے شرابی کو ترشی کا جام دیدیا ہو۔  
 ”تمہاری شادی ہو گئی!“  
 ”جی۔“

دوسری طرف نوکر کی آوازیں گونج رہی تھیں۔

وہ جھاڑیوں اور ڈھلوانوں کے پیچھے سے ہوتا ہوا ایک پہاڑ کی چوٹی پر چھوٹے سے میدان میں پہنچا۔ سامنے ایک خوبصورت بنگلہ تھا۔

دور سے چھوٹے بہن بھائیوں نے زور زور سے جلا نا شروع کر دیا۔ شوشی شوشی بہن۔ بھیا آگئے۔ بھیا آگئے۔ وہ تالیاں بجاتے بنگلے کی طرف بھاگ گئے۔ جہاں اُن کی شوشی بہن کھڑی اور دھڑکیاں دیکھ رہی تھی۔

”منو! یہ شوشی بہن کون ہے؟“

اُس نے ننھے کو گود میں آہستہ سے لیتے ہوئے کہا۔

”خالہ کی لڑکی — شوشی بہن!“

”کون خالہ؟“ — ”ماں جی کی بہن ہے نا — ہماری خالہ — شوشی کی ماں

جی!“

وہ سوچنے لگا۔ ماں جی کی تو بہن نہیں۔ تمام عمارتیں یہی صدر رہا کہ انہی

کوئی بہن نہ ہوئی۔ کوئی سہیلی ہوگی۔ یہی سوچتے سوچتے وہ گھر میں داخل ہوا۔

ابھی سامان وغیرہ کمرہ میں درست کر کے رکھ ہی رہا تھا کہ ننتھے منو نے

لئے آکر شور مچانا شروع کر دیا۔

”بھیا! کیا میرے لئے ریل گاڑی۔ موٹر۔ اور منی کے لئے گریڈ لائے ہو۔“

”ہاں! لایا ہوں —“

ابھی بکس میں بند ہے۔  
 ”مگر آپ میرے لئے کچھ لائے ہیں؟“ یہ شوخی کی آواز تھی۔ وہ چونک  
 اٹھا۔

”آپ کے لئے“ — وہ سوچنے لگا کہ کیا جواب دے۔  
 ”تمہارے لئے بھی ایک حقیر سا تحفہ میرے پاس ہے۔ مگر آپ کو اس کے  
 لینے کی کیا جلدی ہے —  
 ”دیکھیں تو۔ وہ کون سا تحفہ ہے؟“ شوخی نے کمرہ میں داخل ہوتے ہوئے  
 کہا۔

وہ کھونٹی پر لٹکے ہوئے کوٹ کو آہستہ آہستہ ہلا رہی تھی۔ کار سے پھول  
 نکل کر اس کے پاؤں میں آن گرا۔  
 کشور جھپٹا اٹھا۔ دیکھئے آپ نے .....  
 شوخی نے مصحوم نگاہوں سے معافی طلب کرتے ہوئے پھول اٹھا کر اپنی  
 شانوں سے امریل کی طرح نکستی بونی چوٹی میں اٹکالیا۔  
 کتنا اچھا پھول ہے۔ ”کیا میں لے سکتی ہوں کشور بابو؟“  
 اس کی زبان اندر ہی اندر پٹی۔ مگر منہ سے بات نہ نکل سکی۔ جیسے کسی نے  
 ٹانگے لگا دیئے ہوں۔

وہ ناچتی ہوئی شرارتی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کشور کو اس کی  
 اداؤں اور جوانی کی عنایتوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ متواتر بیسنے پر جھبومتی ہوئی

چوٹی کو دیکھ رہا تھا۔

چند ہی دنوں کے بعد اُسکی شادی شوشی سے طے پا گئی۔

شوشی کی خوشیاں جگمگاتھیں۔ وہ تمام دن بچوں کی بلائیں لیتی پھرتی۔  
کبھی مونکا منہ چومتی۔ کبھی شوخ انگلیوں سے اُسے رُللاتی۔ رات کو میٹھی میٹھی لوریاں  
سنا کر سلا دیتی۔

یہ دھیمے دھیمے کُسر کبھی بلند فضا میں پرواز کرتے ہوئے دوڑ نکل جاتے۔  
کشور اپنے کمرہ کے کواڑ بند کر لیتا اور کھان میں مُنہ چھپا لیتا۔ وہ اس شادی پر  
بالکل رضا مند نہ تھا۔

وہ کب تک خاموش رہتا۔ آخر اس نے اپنی ہمت کو بڑھاتے ہوئے ایک  
دن اپنی ماں کو کہہ دیا کہ اُسے یہ شادی منظور نہیں۔

ماں باپ کی منہ — اور التجاؤں کے درمیان رسہ کشی ہو رہی تھی۔ مگر  
— اُس نے واپس کا بج لوٹ اُنیکا ارادہ کر لیا۔

رات بھر وہ ضروری کپڑے سمیٹا رہا۔ اور علی الصبح اپنے کمرے سے باہر نکلا۔  
دروازے پر شوشی کھڑی تھی۔

”تم! اس وقت یہاں“

”جی!“

آپ جا رہے ہیں؟

اُس نے کتاب سے مڑ جایا ہوا گلاب نکالتے ہوئے کہا۔ ”یہ میری یاد ہے۔ آئیے جانیے۔“

اُس کی آواز بھرا گئی۔ آنکھیں چھلک اٹھیں۔ وہ ساڑھی کے آئینے سے منہ چپا کر سسکیاں بھرتی ہوئی اپنے کمرہ میں واپس چلی گئی۔  
کشور آہستہ آہستہ سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ باہر بڈھا نوکر اسکا ایسے منتظر تھا۔  
جیسے اُسے پہلے ہی اطلاع ہو چکی ہو۔

ذکر اوٹچی کیس اٹھائے آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ کشور نہ جانے پتھر کی زمین پر نظریں گاڑے کیا سوچتا جا رہا تھا۔ صبح ہوئی۔ افق میں کہیں کہیں شفق کی لرزتی ہوئی لالی کا عکس خون کا بہتا دھارا معلوم ہوتا تھا۔ اس کے قطرے ہرے ہرے درختوں کے پتوں سے آنسوؤں کی طرح زمین پر ٹپ ٹپ کر رہے تھے۔

کھلے ہوئے لال جنگلی پھولوں سے خون ٹپک رہا تھا۔

”کون ہے؟“ پیچھے آتے ہوئے بدلوئے کہا۔

”او۔۔۔ میٹی رجنی تم۔۔۔ تم آگئی ہو۔“

کشور کے دل کو دھکا سا لگا۔ اُس نے ایجا رہی گردن پھیر کر پیچھے نہ بکھا۔

آخر رجنی نے ہمت کرتے ہوئے کہا۔

”آپ جا رہے ہیں کشور بابو!“

”تمہیں کس نے بلایا تھا اسوقت۔ کیا زخموں پر نمک چھڑکنے آئی ہو۔ اُس نے“

گہری سانس لیتے ہوئے دل ہی دل میں کہا۔  
 آنکھیں بھر آئیں وہ سوچنے لگا کہ یہ سب کھیل ہے جو سینا کی تصویروں  
 کی طرح ایک ایک کر کے اس کی نظروں کے سامنے سے گزر رہا ہے جس سے  
 اس کی زندگی کے ہواؤ میں ایک بڑی رکاوٹ پیدا ہو گئی تھی جیسے کوئی  
 ندی پر بند باندھ دے۔

شام کی سُرخ گہری ہو کر دھیرے دھیرے غائب ہو رہی تھی۔ میرے  
 دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر تھے مگر وہ متواتر رو رہا تھا۔ آنسو پھول کی  
 خشک پتیوں پر گر رہے تھے جیسے اس کے قطرے۔  
 شاید وہ اپنے آنسوؤں سے مرجھائے ہوئے پھول کو زندگی اور تازگی  
 بخشنا چاہتا تھا۔

اسکو معلوم ہی نہ تھا۔ جیسے بیٹے ہوئے لمحے واپس نہیں آتے ایسے  
 ہی خشک پتیاں زندگی اور تازگی حاصل کر نیسے بکسر قاصر ہیں۔ ایک دن نہیں  
 کئی سال تک بھی سیلاب اشک انھیں تروتازہ کرنے سے عاجز ہیں۔

(”سیب کا درخت“ اور کرشن چندر  
 کے ناول سے متاثر ہو کر لکھی گئی۔)

تم شد











